جملہ حقوق محفوظ

سلسلۂ عصمت نمبر ۱۲۹

دودھ کی قیمت

تصنیف

منشی پریم چند

عصمت بک ڈپو دہلی

چوتھی بار   قیمت ایک روپیہ بارہ آنے   ۱۹۴۵

جملہ حقوق محفوظ

دودھ کی قیمت

اور

آٹھ اور سبق آموز نتیجہ خیز مؤثر افسانے

از

منشی پریم چند آنجہانی

عصمت بکڈپو دہلی

اس مجموعے کے افسانے

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	دُودھ کی قیمت	۳
۲	سُم	۱۵
۳	اکسیر	۴۰
۴	عیدگاہ	۵۷
۵	سکونِ قلب	۷۶
۶	ریاست کا دیوان	۹۶
۷	وفا دیوتا	۱۲۰
۸	دو بہنیں	۱۳۹
۹	زاویۂ نگاہ	۱۵۹

دودھ کی قیمت

اب بڑے بڑے شہروں میں دائیاں اور نرسیں سبھی نظر آتی ہیں ۔ لیکن دیہاتوں میں ابھی تک زچہ خانہ روش قدیم کی طرح بھنگیوں کے ہی دائرہ اقتدار میں ہے ۔ اور ایک عرصہ دراز تک اس میں اصلاح کی کوئی امید نہیں ۔ بابو مہیش ناتھ اپنے گاؤں کے زمیندار ضرور تھے، تعلیم یافتہ بھی تھے، زچہ خانہ کی اصلاح کی ضرورت کو بھی تسلیم کرتے تھے لیکن عملی مشکلات کو کیا کرتے ۔ دیہات میں جانے کو کوئی نرس راضی بھی ہوئی تو ایسا معاوضہ طلب کیا کہ بابو صاحب کو سر جھکا کر چلے آنے کے سوا کوئی تدبیر نہ سوجھی لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانے کی نہیں ہمت ہی کیونکر ہو سکتی ۔ ان کا حق الخدمت تو غالباً بابو صاحب کی نصف ملکیت بیع کرنے پر بھی نہ پورا ہوتا ۔ آخر جب تین لڑکیوں کے بعد یہ چوتھا لڑکا پیدا ہوا تو پھر وہی گوڈر تھا اور وہی گوڈر کی بہو۔ بچے بشیتر رات ہی کو پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ آدھی رات کو بابو صاحب کے چپراسی نے گوڈر! گوڈر!! کی ہانک لگائی کہ چماروں کی ٹولی جاگ اٹھی۔

گوڈر کے گھر میں اس روز سعید کی مہینوں سے تیاری تھی ۔ خدشہ تھا تو یہی

کہ کہیں بیٹی نہ ہو جائے نہیں تو پھر وہی بندھا ہوا ایک روپیہ اور وہی ایک ساڑھی بلکہ رہ جائے گی۔ اس مسئلہ پر میاں بیوی میں بارہا تبادلۂ خیالات ہو چکا تھا۔ شرطیں لگ چکی تھیں گوڈر کی بہو کہتی تھی کہ اگر اب کے بٹیا نہ ہو تو منہ نہ دکھاؤں۔ ہاں ہاں منہ نہ دکھاؤں اور گوڈر کہتا تھا کہ دیکھو بیٹی ہوگی، اور بیچ کھیت بیٹی ہوگی۔ بیٹا پیدا ہوا تو مونچھیں منڈوا لوں گا۔ شاید گوڈر سمجھتا کہ اسی طرح بھنگی میں مخالفانہ جوش پیدا کر کے وہ بیٹے کی آمد کے لئے راستہ تیار کر رہا ہے۔

بھنگی بولی "اب منڈا لے مونچھیں ڈاڑھی جا۔ کہتی تھی بٹیا ہوگا پر سُنے ہی نہیں۔ اپنی رٹ لگائے۔ کُھد تیری مونچھیں مونڈوں گی۔ کھونٹی تو رکھوں نہیں۔"

گوڈر نے کہا "اچھا مونڈھ لینا بھلی مانس، مونچھیں کیا پھر نکلیں گی ہی نہیں۔ تیسرے دن پھر دیکھے گی جوں کی توں ہیں۔ مگر جو کچھ ملے گا۔ اس میں آدھا رکھ لوں گا کہے دیتا ہوں۔"

بھنگی نے انگوٹھا دکھایا اور اپنے تین مہینے کے بچے کو گوڈر کے سپرد کر، سپاہی کے ساتھ چل دی۔

گوڈر نے پکارا "اری سُن تو کہاں بھاگی جاتی ہے۔ مجھے بھی تو روشن چوکی بجانے جانا پڑے گا۔"

بھنگی نے دُور ہی سے کہا "تو کون بڑی مشکل ہے اسے دھرتی پر لٹا دینا۔ اور روشن چوکی بجانا۔ میں آ کر دُودھ پلا دیا کروں گی۔"

(۲)

مہیش ناتھ کے ہاں اب کی بھنگی کی خوب خاطر کی گئی۔ صبح کو حریرہ ملتا۔ دوپہر کو

پوریاں اور حلوا۔ تیسرے پہر کو پھر اور رات کو پھر اور گودڑ کو بھی بھر پور پرو سا ملتا تھا۔ بھنگی اپنے بچے کو دن بھر میں دو بار سے زیادہ دُودھ نہ پلا سکتی۔ اُس کے لئے اُوپر کا دودھ مہیا کر دیا جاتا۔ بھنگی کا دودھ بابو صاحب کا بچہ پیتا تھا اور یہ سلسلہ بارہویں دن بھی نہ بند ہوا۔ مالکن موٹی تازی عورت تھیں، مگر اب کی کچھ ایسا اتفاق کہ دُودھ ہوا ہی نہیں۔ تینوں لڑکیوں کی بار اتنے افراط سے دودھ ہوتا تھا کہ لڑکیوں کو بدہضمی ہو جاتی تھی۔ اب کی ایک بُوند نہیں۔ بھنگی جَنائی بھی تھی اور دودھ پلائی بھی۔

مالکن نے کہا "بھنگی ہمارے بچے کو پال دے۔ پھر جب تک جئے بیٹھی کھاتی رہنا پانچ بیگھے معافی دلوا دوں گی۔ تیرے پوتے تک کھائیں گے۔"

اور بھنگی کا لاڈلا اوپر کا دودھ نہ ہضم کر سکنے کے باعث بار بار قے کرتا اور روز بروز لاغر ہوتا جاتا تھا۔ بھنگی کہتی "اور موُنڈن میں چوڑے لونگی۔ بہوجی کہے دیتی ہوں۔"

بہوجی۔ "ہاں ہاں چوڑے لینا بھائی۔ دھمکاتی کیوں ہے۔ چاندی کے لے گی یا سونے کے۔"

"واہ بہوجی واہ، چاندی کے چوڑے پہن کے کسے منہ دکھاؤں گی۔"

بہوجی۔ "اچھا سونے کے لینا بھائی کہتی تو ہوں۔"

"اور بیاہ میں کنٹھا لونگی۔ اور چودھری (گودڑ) کے لئے ہاتھوں کے توڑے۔"

بہوجی۔ "وہ بھی لینا۔ وہ دن تو بھگوان دکھائیں۔"

گھر میں مالکن کے بعد بھنگی کی حکومت تھی۔ مہریاں۔ مہراجن، مزدورنیں سب اس کا رُعب مانتی تھیں۔ یہاں تک کہ خود بہوجی اس سے دب جاتی تھیں۔ ایک بار تو اس نے مہیش ناتھ کو بھی ڈانٹا تھا۔ ہنس کر ٹال گئے۔ بات چلی تھی بھنگیوں کی مہیش ناتھ

نے کہا تھا: "دنیا میں اور چاہے جو کچھ ہو جائے۔ بھنگی بھنگی رہیں گے۔ انھیں آدمی بنانا مشکل ہے۔"

اس پر بھنگی نے کہا تھا: "مالک بھنگی تو بڑوں بڑوں کو آدمی بناتے ہیں، انھیں کیا کوئی آدمی بنائے گا۔"

یہ گستاخی کر کے کسی دوسرے موقع پر بھلا بھنگی سلامت رہتی۔ سر کے بال اُکھاڑ لئے جاتے۔ لیکن آج بابو صاحب ہنسے قہقہہ مار کر بولے:۔

"بھنگی بات بڑے پتے کی کہتی ہے۔"

(۳)

بھنگی کی حکومت سال بھر تک قائم رہی پھر چھن گئی، بچے کا دودھ چھڑا دیا گیا۔ اب برہمنوں نے بھنگی کا دودھ پینے پر اعتراض کیا۔ موٹے رام شاستری تو پرائشچت کی تجویز کر بیٹھے۔ لیکن مہیش ناتھ احمق نہ تھے۔ پھٹکار بتائی۔ پرائشچت کی خوب کہی آپ نے شاستری جی۔ کل تک اسی بھنگن کا خون پی کر پلا اب پرائشچت کرنا چاہئے۔ واہ!"

شاستری جی بولے۔ "بیشک کل تک بھنگن کا خون پی پلا کر پلا۔ گوشت کھا کر پلا یہ بھی کہہ سکتے ہو۔ لیکن کل کی بات کل تھی۔ آج کی بات آج ہے جگن ناتھ پوری میں تو چھوت اچھوت سب ایک ساتھ کھاتے ہیں، مگر یہاں تو نہیں کھا سکتے کھچڑی تک کھا لیتے ہیں۔ بابو جی اور کیا کہیں پوری تک نہیں رہ جاتے لیکن اچھے ہو جانے پر تو نہیں کھا سکتے۔"

"تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دھرم بدلتا رہتا ہے۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ۔"

اور کیا! راجہ کا دھرم الگ، پرجا کا دھرم الگ، امیر کا دھرم الگ، غریب کا دھرم الگ۔ راجے مہاراجے جو چاہیں کھائیں، جس کے ساتھ چاہیں کھائیں، جس کے ساتھ چاہیں شادی بیاہ کریں۔ ان کے لئے کوئی قید نہیں، راجہ ہیں۔ مگر ہمارے اور تمہارے لئے تو قدم قدم پر بندشیں ہیں۔ قیدیں ہیں، اس کا دھرم ہے، پراشچت تو نہ ہوا لیکن بھنگی سے اسکی سلطنت چھین لی گئی برتن، کپڑے، اناج اتنی کثرت سے ملے کہ وہ اکیلی نہ لیجا سکی، اور سونے کے چوڑے بھی ملے، اور ایک دو نئی اور خوبصورت ساڑیاں معمولی نین سکھ کی نہیں جیسی لڑکیوں کی بارلی تھیں۔

(۴)

اسی سال چیچک کا زور ہوا گوڈر پہلے ہی زد میں آگیا۔ بھنگی اکیلی رہ گئی۔ مگر کام جوں کا توں چلتا رہا۔ بھنگی کے لئے گوڈر اتنا ضروری نہ تھا جتنا گوڈر کے لئے بھنگی۔ لوگ منتظر تھے کہ بھنگی اب گئی اب گئی۔ فلاں بھنگی سے بات چیت ہوئی۔ فلاں چودھری آئے۔ لیکن بھنگی کہیں نہ گئی۔ یہاں تک کہ پانچ سال گذر گئے اور منگل دبلا اور کمزور اور دائم المریض رہنے پر بھی دوڑنے لگا۔ ماں کا دودھ نصیب ہی نہ ہوا۔ دائم المریض کیوں نہ رہتا

ایک دن بھنگی مہیش ناتھ کے مکان کا پرنالہ صاف کر رہی تھی بہینوں سے غلاظت جمع ہوگئی تھی، آنگن میں پانی بھرا رہنے لگا تھا۔ پرنالے میں ایک لمبا موٹا بانس ڈال کر زور سے ہلا رہی تھی۔ پورا۔ پورا داہنا ہاتھ پرنالے کے اندر تھا کہ یکایک اس نے چلا کر ہاتھ باہر نکال لیا۔ اور اسی وقت ایک لمبا سا کالا سانپ پرنالے سے نکل کر بھاگا۔ لوگوں نے دوڑ کر اسے تو مار ڈالا لیکن بھنگی کو نہ بچا سکے۔ خیال تھا کہ پانی کا سانپ ہے زیادہ زہریلا نہ ہوگا۔ اس کے پہلے کچھ غفلت کی گئی۔ جب زہر جسم میں پیوست ہوا اور لہریں

ٹنے لگیں تب پتہ چلا کہ پالی کا سانپ نہیں کالا سانپ تھا۔

منگل ابد یتیم تھا۔ دن بھر مہیش بابو کے دروازے پر منڈلایا کرتا۔ گھر میں اتنا جھوٹا بچا تھا کہ ایسے ایسے دس پانچ بچے سیر ہو سکتے تھے۔ منگل کو کوئی تکلیف نہ تھی ہاں وُور ہی سے اُسے مٹی کے ایک سکورے میں کھانا ڈال دیا جاتا اور گاؤں کے لڑکے اس سے دُور دُور رہتے تھے۔ یہ بات اسے اچھی نہ لگتی تھی۔ سب لوگ اچھے اچھے برتنوں میں کھاتے ہیں اس کے لئے مٹی کے سکورے! یوں اُسے اس تفریق کا مطلق احساس نہ ہوتا۔ لیکن لڑکے اسے چڑھا چڑھا کر اس ذلت کے احساس کو سان پر چڑھاتے رہتے تھے۔ مکان کے سامنے ایک نیم کا درخت تھا اسی کے نیچے منگل کا ڈیرا تھا۔ ایک پھٹا پھٹا سا ٹاٹ کا ٹکڑا دو سکورے اور ایک دھوتی جو مہیش بابو کے خوش نصیب فرزند سریش کے اُتارے کپڑوں میں تھی جاڑا، گرمی، برسات ہر موسم کے لئے وہ جگہ ایک سی آرام دہ تھی۔ یہی اس کی خصوصیت تھی۔ اور سخت جان منگل جھلستی ہوئی لُو اور کڑاکے کے جاڑوں اور موسلا دھار بارش میں بھی زندہ تھا اور تندرست تھا۔ بس اس کا کوئی رفیق تھا تو گاؤں کا ایک کتا جو اپنے ہم چشموں کی بدمزاجیوں اور تنگ ظرفیوں سے تنگ آ کر منگل کے زیر سایہ آ پڑا تھا۔ کھانا دونوں کا ایک تھا کچھ طبیعت بھی یکساں تھی اور غالباً دونوں ایک دوسرے کے مزاج سے واقف ہو گئے تھے۔

منگل نے اس کا نام رکھا تھا ٹامی مگر ٹامی مہیش ناتھ کے انگریزی کُتے کا نام تھا اس لئے اس نام کا استعمال وہ اسی وقت کرتا جب دونوں رات کو سونے لگتے۔

منگل کہتا "دیکھو ٹامی۔ ذرا اور کھسک کر سوؤ، آخر میں کہاں لیٹوں، سارا ٹاٹ

تو تم نے گھیر لیا۔ ٹامی، کُوں، کُوں کرتا اور دُم ہلاتا اور بجائے اس کے کہ کھسک جائے اور اُوپر چڑھ آتا اور منگل کا منہ چاٹنے لگتا۔ شام کو وہ ایک بار روز اپنا گھر دیکھنے اور تھوڑی دیر رونے جاتا۔ پہلے سال پھوس کا چھپر گرا۔ دوسرے سال ایک دیوار گری اور اب صرف آدھی آدھی دیواریں کھڑی تھیں جن کا اوپر کا حصّہ نوکدار ہو گیا تھا۔ یہیں اُسے محبت کی دولت ملی تھی، وہی مزہ، وہی یاد، وہی کشش اسے ایکبار اس ویرانے میں کھینچ لے جاتی تھی اور ٹامی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا تھا وہ کھنڈر کی مخروطی دیوار پر بیٹھ جاتا اور زندگی کے آئینوالے اور گذشتہ خواب دیکھنے لگتا اور ٹامی دیوار پر کود جانے کی بار بار ناکام کوشش کرتا۔

(۵)

ایک دن کئی لڑکے کھیل رہے تھے۔ منگل بھی پہونچکر دُور کھڑا ہو گیا۔ سریش کو اُس پر رحم آیا۔ یا کھیلنے والوں کی جوڑی پوری نہ پڑتی تھی کچھ ہی ہو۔ اُس نے تجویز کی آج منگل کو بھی کھیل میں شریک کر لیا جائے۔ یہاں کون دیکھنے آتا ہے۔

سریش نے منگل سے پوچھا "کیوں رے کھیلے گا"؟

منگل بولا" کھلاؤ گے تو کیوں نہ کھیلوں گا"

سریش "اچھا تو ہم تینوں سوار بنتے ہیں۔ تم ٹٹو بن جاؤ۔ پھر ہم لوگ تمھارے اوپر سوار ہو کر گھوڑا دوڑائیں گے"

منگل نے پوچھا" میں برابر گھوڑا ہی رہوں گا کہ سواری بھی کروں گا"

یہ مسئلہ ٹیڑھا تھا سریش نے ایک لمحہ غور کر کے کہا" تجھے کون اپنی پیٹھ پر بٹھائے گا سوچ آخر تو بھنگی ہے کہ نہیں؟"

منگل نے کسی قدر دلیر ہو کر کہا "میں کب کہتا ہوں کہ میں بھنگی نہیں ہوں، لیکن جب تک مجھے بھی سواری کرنے کو نہ ملے گی میں گھوڑا نہ بنوں گا۔ تم لوگ مجھ سے سوار بنوگے اور میں گھوڑا ہی بنا رہوں گا۔"

سریش نے تحکمانہ لہجہ میں کہا "تجھے گھوڑا بننا پڑے گا۔" اس نے منگل کو پکڑنا چاہا۔ منگل بھاگا۔ سریش نے دوڑایا۔ منگل نے قدم اور تیز کیا۔ سریش نے بھی زور لگایا۔ مگر بسیار خوری نے اسے تھل تھل بنا دیا تھا۔ اور دوڑنے سے اس کا سانس پھولنے لگتا تھا۔ آخر سریش نے رُک کر کہا "آکر گھوڑا بنو منگل نہیں کبھی پاؤ گے تو بُری طرح پیٹوں گا۔"

"تمھیں بھی گھوڑا بننا پڑے گا۔"

"اچھا ہم بھی بن جائیں گے۔"

"تم پیچھے سے بھاگ جاؤ گے پہلے تم بن جاؤ۔ میں سواری کر لوں۔ پھر میں بنوں گا۔"

سریش نے چکمہ دیا تھا۔ منگل کے اس مطالبے نے برہم کر دیا۔ ساتھیوں سے بولا "دیکھو اس کی بدمعاشی بھنگی ہے۔" تینوں نے اب کی منگل کو گھیر لیا اور زبردستی گھوڑا بنا دیا۔ سریش اپنا وزنی جسم لیکر اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا اور ٹک ٹک کر کے بولا۔ "چل گھوڑے چل" مگر اس بوجھ کے نیچے غریب منگل کے لئے ہلنا بھی مشکل تھا۔ دوڑنا تو دُور کی بات تھی۔ ایک لمحہ تو وہ ضبط کئے چوپایہ بنا کھڑا رہا۔ لیکن ایسا معلوم ہونے لگا کہ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی جاتی ہے۔ اس نے آہستہ سے پیٹھ سکیڑی اور سریش کی ران کے نیچے سے سرک گیا۔ سریش گدسے گر پڑے اور بھونپو بجانے لگے۔ ماں نے

سُنا سرلیش کیوں رو رہا ہے۔ گاؤں میں کہیں سرلیش روئے، اُن کے ذکی الحس کانوں میں ضرور آواز آجاتی تھی۔ اور اس کا رونا تھا بھی دوسرے لڑکوں سے بالکل نرالا، جیسے چھوٹی لائن کے انجن کی آواز۔

ایک منٹ میں سرلیش آنکھیں ملتا ہوا گھر میں آیا۔ آپ کو جب کبھی رونے کا اتفاق ہوتا تھا تو گھر میں فریاد لے کر ضرور آتے تھے۔ ماں چُپ کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ دے دیتی تھی۔ آپ تھے تو آٹھ سال کے مگر بہت بیوقوف حد سے زیادہ پیارے، ماں نے پوچھا:- "کیوں روتا ہے سرلیش؟ کس نے مارا؟" سرلیش نے روتے ہوئے کہا "منگل نے چھوا دیا۔"

پہلے تو ماں کو یقین نہ آیا لیکن جب سرلیش قسمیں کھانے لگا تو یقین لانا لازم ہو گیا۔ اُس نے منگل کو بلوایا اور ڈانٹ کر بولی "کیوں رے منگلوا اب تجھے بدحاشی سوجھنے لگی۔ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ کبھی سرلیش کو چھونا نہیں! یاد ہے کہ نہیں، بول؟" منگل نے دبی آواز سے کہا "یاد ہے۔" "تو پھر تو نے اُسے کیوں چھوا تو نے نہیں چھوا تو یہ روتا کیوں تھا؟" "یہ گر پڑے اس لئے رونے لگے۔"

چوری اور سینہ زوری۔ دیوی دانت پیس کر رہ گئیں۔ مارتیں تو اُسی وقت اشنان کرنا پڑتا۔ قمچی تو ہاتھ میں لینا ہی پڑتی۔ اور چھوت کی برقی رَو قمچی کے راستہ ان کے جسم میں سرایت کر جاتی۔ اس لئے جہاں تک گالیاں دے سکیں دیں اور حکم دیا کہ اسی وقت یہاں سے نکل جا۔ پھر جو تیری صورت نظر آئی تو خون ہی پی جاؤں گی۔ مُفت کی روٹیاں کھا کھا کر شرارت سوجھتی ہے۔"

منگل میں غیرت تو کیا ہوگی خوف تھا چپکے سے اپنے سکورے اُٹھائے

ٹاٹ کا ٹکڑا بغل میں دبایا دھوتی کندھے پر رکھی اور روتا ہوا وہاں سے چل پڑا اب وہ یہاں کبھی نہ آئیگا۔ یہی تو ہوگا۔ بھوکوں مر جائیگا۔ کیا ہرج ہے۔ اس طرح جینے سے فائدہ ہی کیا۔ گاؤں میں اور کہاں جاتا بھنگی کو کون پناہ دیتا، وہی اپنے بے در و دیوار کی آڑ تھی جہاں پہلے دنوں کی یادگاریں اس کے آنسو پونچھ سکتی تھیں وہیں جاکر پڑ رہا اور خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہ گذرا ہوگا کہ ٹامی بھی اُسے ڈھونڈتا ہوا آ پہونچا۔

(٦)

لیکن جُوں جُوں شام ہوتی تھی اُس کا احساس ذلت بھی غائب ہوتا جاتا تھا بچپن کی بیتاب کُن بُھوک جسم کا خون پی پی کر اور بھی بے پناہ ہوتی جاتی تھی۔ آنکھیں بار بار سکوروں کی طرف اُٹھ جاتیں۔ اُس نے مشورۃً ٹامی سے کہا کھاؤ گے کیا، میں تو بھوکا ہی لیٹ رہوں گا۔ ٹامی نے کُوں کُوں کر کے شاید کہا۔ اس طرح کی ذلتیں تو ساری زندگی بھر سہنی ہیں۔ اگر ہمت ہار گئے تو کیسے کام چلے گا۔ مجھے دیکھو نہ ابھی کسی نے ڈنڈا مارا، چیخ پڑا۔ پھر ذرا دیر کے بعد دُم ہلاتا ہوا اُس کے پاس جا پہنچا۔ ہماری زندگی اسی لئے ہے بھائی۔

منگل بولا " تم جاؤ جو کچھ ملجائے کھالو۔ میری پروا نہ کرو۔" ٹامی نے پھر اپنی سگستانی بولی میں کہا " اکیلا نہیں جاتا تمھیں ساتھ لے کر چلوں گا " ایک لمحہ بعد بُھوک نے تالیف کا ایک نیا پہلو اختیار کیا۔ " مالکن تلاش کر رہی ہوں گی، کیوں ٹامی؟ " اور کیا بابو جی اور سرلش کھا چکے ہوں گے۔ کہار نے اُن کی تھالی کا جھوٹا نکال لیا ہوگا اور ہمیں پکار رہا ہوگا " " بابو جی اور سرلش دونوں کی تھالیوں میں گھی اور وہ میٹھی

میٹھی چیز، ہاں ملائی" ہماری آواز نہ سُنائی دے گی تو سب کا سب گھورا پر ڈال دیں گے۔ ذرا دیکھ لیں کہ ہیں کوئی پوچھنے آتا ہے۔" یہاں کون پوچھنے آئیگا کوئی بامن ہو۔"

" اچھا تو چلو وہیں چلیں مگر چھپے ہوئے رہیں گے۔ اگر کسی نے نہ پکارا تو میں لوٹ آؤں گا یہ سمجھ لو۔"

دونوں وہاں سے نکلے اور آکر مہیش ناتھ کے دروازے پر ایک کونے میں دُبک کر کھڑے ہو گئے۔ ٹامی شاید اِدھر اُدھر کی خبر لانے چلا گیا۔ مہیش بابو تھالی پر بیٹھ گئے تھے نوکروں کی بات چیت سے معلوم ہوتا تھا ایک نے کہا "آج منگلو نہیں دکھائی دیتا بھوکا ہوگا۔ بچارا۔ مالکن نے ڈانٹا تھا۔ اسی لئے بھاگا ہے شاید" منگل کے جی میں آیا چل کر اس آدمی کے قدموں پر گر پڑے۔ دوسرے نے جواب دیا" اچھا ہوا ٹکا لاگیا۔ نہیں سبیرے سبیرے بھنگی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔" منگل اوراندھیرے میں کھسک گیا۔ اب کیا امید کی جا سکتی تھی۔ مہیش اور سریش تھالی سے اُٹھ گئے نوکر ہاتھ منہ دُھلا رہا ہے۔ بابو جی اب حقہ پئیں گے۔ سریش سو ئیے گا۔ غریب منگل کی کسے فکر ہے۔ اتنی دیر ہوگئی کسی نے نہیں پکارا کون پکارے گا۔ منگل آدھ گھنٹے تک وہاں دُبکا رہا کسی نے اس کا نام نہ لیا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور جانا ہی چاہتا تھا کہ اس نے اسی کہار کو ایک تھال میں جھوٹا کھانا لے جاتے دیکھا شاید گھوڑے پر ڈالنے جا رہا تھا۔ منگل اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آگیا تھا۔ اب صبر نہ ہو سکتا تھا۔ کہار نے کہا "ارے! تو یہاں تھا ہم نے سمجھا کہیں چلا گیا ہے کھالے۔ میں پھینکنے لے جا رہا تھا۔" منگل نے کہا" میں تو بڑی دیر

سے یہاں کھڑا تھا۔" تو بولا کیوں نہیں؟" "ڈر لگتا تھا" "اچھا لے کھا لے" منگل نے تھال اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اُسے ایسی نظر سے دیکھا جس میں شکر اور احسانمندی کی ایک دنیا چھپی ہوئی تھی۔ پھر اور وہ دونوں نیم کے درخت کے نیچے حسب معمول کھانے لگے۔ منگل نے ایک ہاتھ سے ٹامی کا سر سہلا کر کہا" دیکھا پیٹ کی آگ ایسی ہوتی ہے۔ رات کی ماری ہوئی روٹیاں بھی نہ ملتیں تو کیا کرتے" ٹامی نے دم ہلائی "سرلیش کو اماں ہی نے پالا ہے ٹامی" ٹامی نے پھر دُم ہلا دی" لوگ کہتے ہیں دودھ کا دام کوئی نہیں چکا سکتا" ٹامی نے پھر دُم ہلا دی۔" اور مجھے دودھ کا یہ دام مل رہا ہے" ٹامی نے پھر دم ہلا دی۔

"عصمت" ۱۹۳۵ء

کُسم

سال بھر کی بات ہے، ایک دن شام کو ہوا خوری کے لئے جا رہا تھا کہ مسٹر نشاط سے ملاقات ہو گئی۔ میرے پرانے دوست ہیں۔ نہایت بے تکلف اور زندہ دل، آگرہ میں قیام رکھتے ہیں۔ خوش گو شاعر ہیں۔ ان کی بزم سخن میں کئی بار شریک ہو چکا ہوں۔ ایسا فنا فی الشعر آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ پیشہ تو وکالت ہے، مگر غرق رہتے ہیں فکر سخن میں چونکہ ذہین آدمی ہیں معاملہ کی تہ تک آسانی سے پہنچ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی مقدمات مل جاتے ہیں۔ لیکن کچہری کے باہر عدالت یا مقدمہ کا ذکر اُن کے لئے ممنوع ہے۔ عدالت کی چار دیواری کے اندر پانچ گھنٹے وہ وکیل ہوتے ہیں، چار دیواری کے باہر نکلتے ہی شاعر ہیں۔ جب دیکھئے شعر و سخن کے چرچے ہو رہے ہیں۔ اشعار سن رہے ہیں، داد دے رہے ہیں۔ جھوم رہے ہیں۔ اور اپنا کلام سناتے وقت تو اُن پر بلا مبالغہ وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ لہجہ بھی اتنا دلپذیر ہے کہ بے اختیار اشعار جگر میں چبھ جاتے ہیں۔ رُو حانیات میں شعریت پیدا کرنا؛ تصوف میں گُل و چمن کی بہار دکھانا ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ وہ

جب لکھنؤ آتے مجھے پہلے اطلاع دیدیا کرتے تھے۔ آج اُنہیں لکھنؤ میں غیر متوقع دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ میں نے پوچھا" خیریت تو ہے۔ آپ یکایک یہاں کیسے نمودار ہوئے، مجھ کو اطلاع تک نہ دی"

بولے" بھائی جان بڑی پریشانی میں مبتلا ہوں۔ آپ کو اطلاع دینے کا موقع نہ تھا۔ پھر آپ کے گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہوں۔ اس تکلف کی کیا ضرورت ہے کہ آپ میرے لئے کوئی خاص اہتمام کریں۔ میں ایک اشد ضروری معاملہ میں آپ کو تکلیف دینے آیا ہوں۔ اس وقت ہوا خوری ملتوی کیجئے اور مل کر میرا قصۂ غم سنئے"

" آپ نے تو مجھے وحشت میں ڈال دیا۔ آپ اور قصۂ غم مجھے تو وحشت ہوتی ہے" "چلئے اطمینان سے بیٹھوں تو سناؤں"

ہم دونوں گھر کی طرف چلے۔

منہ ہاتھ دھوکر، شربت پانی اور پان الائچی کے بعد مسٹر شاطر نے اپنی داستان سنانی شروع کی۔.

کُسم کی شادی میں تو آپ تشریف لیگئے تھے اس سے قبل بھی آپ نے اُسے دیکھا تھا، میرا خیال ہے کہ ایک سلیم الطبع نوجوان کی کشش کے لئے جن لوازمات کی ضرورت ہے، وہ سب اس میں کافی سے زیادہ موجود ہیں، آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے گرمجوشی کے ساتھ کہا۔" میں آپ سے کہیں زیادہ کُسم کا مدّاح ہوں۔ ایسی سلیقہ دار، باحیا، متین خوش مزاج اور حسین لڑکی میں نے نہیں دیکھی"

شاطر صاحب نے مایوسانہ تبسم کے ساتھ فرمایا:" وہی کُسم اپنے شوہر کی بے اعتنائی کے باعث رو رو کر مری جاتی ہے۔ اسکی رخصتی ہوئے ایک سال ہو رہا ہے

اس دوران میں دو تین بار سسرال گئی لیکن اس کا شوہر اس سے مخاطب ہی نہیں ہوتا۔ اس کی صورت سے بیزار ہے۔ میں نے ہر چند چاہا کہ اُسے بُلا کر دریافت حال کروں، مگر میرے خطوط کا نہ جواب دیتا ہے نہ آتا ہے، نہ جانے ایسی کیا بات ہوگئی کہ اس نے یہ روش اختیار کی۔ اب سُنتا ہوں اسکی دوسری شادی ہونیوالی ہے کُسم کا بُرا حال ہو رہا ہے، آپ شاید اُسے دیکھ کر پہچان بھی نہ سکیں۔ شب و روز رونے کے سوا اُسے کوئی کام نہیں ہے۔ اس سے آپ ہماری پریشانی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ زندگی کی پیاری آرزوئیں پامال ہوئی جاتی ہیں۔ ہمیں پرماتما نے کوئی لڑکا نہ دیا۔ مگر ہم اپنی کُسم کو پاکر اس کا شکر کرتے تھے۔ اُسے کتنی ناز و نعم سے پالا کبھی اس کو پھول کی چھڑی سے بھی نہ چھوا۔ اس کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ اس نے بی۔ اے پاس نہیں کیا۔ لیکن خیال کی وسعت اور معلومات میں وہ کسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ عورت سے کم نہیں۔ آپ نے اس کے مضامین دیکھے ہیں۔ اس نے مُباحثہ کئے ہیں۔ خانہ داری میں وہ اتنی ہوشیار ہے کہ میرے گھر کا قریب قریب سارا انتظام اُس کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن اپنے شوہر کی نگاہ میں وہ دنیا کی بدترین عورت ہے۔ بار بار پوچھتا ہوں تو نے اُسے کچھ کہدیا ہے، یا کیا بات ہے۔ آخر وہ تجھ سے کیوں برگشتہ خاطر ہے کُسم اسکے جواب میں رو کر یہی کہتی ہے کہ مجھ سے تو اُنھوں نے کبھی کوئی بات چیت ہی نہیں کی۔ وہ پہلے دن ذرا دیر کے لئے کُسم کے پاس آیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اُس نے کُسم سے کوئی سوال کیا ہوگا۔ اس نے شرم کے باعث جواب نہ دیا ہوگا۔ میں یہ بھی ماننے کو تیار ہوں کہ اُس نے دو چار بار وہی سوال کیا ہوگا۔ کُسم نے سر نہ اُٹھایا ہوگا۔ آپ جانتے ہی ہیں وہ کتنی شرمیلی ہے۔ بس حضرت رُوٹھ گئے ہوں گے۔ میں تو

گمان ہی نہیں کرسکتا کہ کُسم جیسی لڑکی سے کوئی مرد بے اثر رہ سکتا ہے لیکن طبیعت کی اُفتاد کا کوئی کیا کرے؟ غریب نے اپنے شوہر کے نام بارہا خطوط درد اور سوز میں ڈوبے ہوئے لکھے مگر اُس ظالم نے اسکے خطوط کا کبھی جواب نہیں دیا۔ سب ہی خطوط واپس کر دیئے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس سنگدل کو کیسے نرم کردں میری غیرت تو تقاضا نہیں کرتی کہ خود اسکے پاس کچھ لکھوں۔ اب آپ سے یہی التجا ہے کہ اس معاملہ میں میری امداد کیجئے۔ ورنہ غریب کُسم مر جائے گی۔ اور اس کے بعد ہم دونوں بھی اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے اس کی کوفت اب نہیں دیکھی جاتی؟

شاطر کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ میں بھی بہ غایت متاثر ہوا۔ سرگرمی سے بولا۔ "میں آج ہی مراد آباد جاؤں گا۔ اور اس خود ماغ لونڈے کی بُری طرح خبر لوں گا کہ وہ بھی یاد کرے گا۔ بچہ کو زبردستی گھسیٹ کر لاؤں گا اور کُسم کے پیروں پر گرا دوں گا"

شاطر صاحب میری اس خود اعتمادی پر مسکرا کر بولے۔ "اُس سے کہا کہیں گے؟"

"یہ نہ پوچھئے تالیف قلب کے جتنے نسخے ہیں۔ اُن سبھی کی آزمائش کروں گا"

"تو آپ کو مطلق کامیابی نہ ہوگی وہ اتنا خلیق، اتنا خندہ رو، اتنا منکسر المزاج، اتنا شیریں زبان ہے کہ آپ وہاں سے اُس کے مدّاح ہو کر لوٹیں گے۔ وہ ہر وقت دست بستہ آپ کے روبرو کھڑا ہوگا۔ آپ کی ساری تُندی اور تیزی فرد ہو جائے گی۔ آپ کے قلم کو خدا نے کمال عطا کیا ہے، آپ نے صدہا نوجوانوں کی تالیف قلب کی ہے۔ دل میں درد پیدا کرنا آپ کا حصّہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کُسم کی جانب سے ایک ایسا درد ناک، ایسا دل ہلا دینے والا خط لکھیں کہ وہ نادم ہو جائے اور اُس کے دل میں سویا ہوا انسان جاگ پڑے۔ میں آپ کا تازیست ممنون رہوں گا"

مسٹر شاطر شاعر ہی تو ٹھیرے۔ اس تجویز میں بھی شعریت کا عنصر غالب تھا۔ آپ میرے کئی قصّے پڑھ کر رو پڑے ہیں۔ اس سے آپ کو یقین ہو گیا ہے کہ میں جس دل کو چاہوں۔ متاثر کر سکتا ہوں۔ آپ کو یہ معلوم نہیں کہ ہر شخص شاعر نہیں ہوتا۔ اور نہ یکساں رقیق القلب جن قصّوں کو پڑھ کو شاطر صاحب روئے ہیں۔ اُنھیں قصّوں کو کتنے ہی حضرات نے سنٹی منٹل کہہ کر کتاب پھینک دی ہے۔ مگر اس وقت اس نکتہ چینیوں کا موقعہ نہ تھا۔ وہ سمجھے میں اپنا پیچھا چھوڑانا چاہتا ہوں۔ اس لئے میں نے ہمدردانہ انداز سے کہا "آپ کی تجویز سے مجھے پورا اتفاق ہے اور اگرچہ میرے خیال میں آپ نے امکانات کا مبالغہ آمیز اندازہ کیا ہے لیکن میں خط لکھ دوں گا۔ اور جہاں تک ہو سکے گا اظہار درد کے ساتھ اس کے جذبۂ انصاف کو متحرک کرنے کی کوشش بھی کروں گا لیکن اگر آپ غیر مناسب نہ سمجھیں تو پہلے مجھے وہ خطوط دکھا دیں جو کُسم نے اپنے شوہر کے نام لکھے تھے۔ اس نے خطوط لوٹا ہی دیئے تھے۔ اگر کُسم نے پھاڑ نہ ڈالے ہوں گے تو وہ چھٹھیاں ضرور اس کے پاس ہوں گی۔ اُن خطوط سے مجھے معلوم ہو جائے گا کہ کن پہلوؤں پر لکھنے کی گنجائش باقی ہے"

مسٹر شاطر نے جیب سے خطوں کا ایک پلندا نکال کر میرے سامنے رکھدیا۔ اور بولے "میں سارے خطوط لیتا آیا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ آپ اُن خطوط کو دیکھنا چاہیں گے۔ آپ اُنھیں شوق سے دیکھیں۔ کسم جیسی میری لڑکی ہے ویسی ہی آپ کی بھی لڑکی ہے۔ آپ سے کیا پردہ ہے"!

میں نے خطوں کو پڑھنا شروع کیا۔ گلابی کاغذ پر بہت خوشخط لکھے ہوئے معطر خط تھے۔

پہلا خط

میرے آقا! مجھے یہاں آئے ایک ہفتہ ہو گیا۔ لیکن آنکھیں نہیں جھپکتیں۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گذر جاتی ہے۔ بار بار سوچتی ہوں مجھ سے ایسی کیا خطا ہوئی ہے کہ آپ مجھے یہ سزا دے رہے ہیں۔ آپ مجھے جھڑکیں۔ کوسیں۔ مزاج چاہے تو میری گوشمالی بھی کریں، میں ہر ایک سزا برداشت کر لوں گی۔ لیکن یہ بے اعتنائی مارے ڈالتی ہے۔ میں آپ کے یہاں ایک ہفتہ رہی۔ میرا پرماتما جانتا ہے کہ میرے دل میں کیا کیا ارمان تھے۔ میں کتنے اضطراب سے دن بھر ماہی بے آب کی طرح تڑپتی رہتی تھی۔ کتنی بار کوشش کی کہ آپ سے کچھ پوچھوں، آپ سے اپنی خطاؤں کی معافی کی التجا کروں۔ لیکن آپ میرے سائے سے بھی دُور بھاگتے تھے مجھے کوئی موقع نہ ہاتھ آیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب دوپہر کو سارا گھر سو جاتا تھا تو میں آپ کے کمرے میں جاتی تھی اور گھنٹوں سر جھکائے کھڑی رہتی تھی۔ مگر آپ نے کبھی التفات نہ کیا آپ نے مجھے آنکھ بھر کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہوتی تھی۔ اُس کا شاید آپ اندازہ نہ کر سکیں گے۔ میری جیسی بدنصیب عورتیں اس کا کچھ اندازہ کر سکتی ہیں۔ میں نے اپنی سہیلیوں سے اُن کی عروسی کے تذکرے سُن سُن کر جو خیالی جنّت بنائی تھی اسے آپ نے کتنی بیدردی سے منہدم کر دیا۔ کیا میرا آپ کے اوپر کوئی حق نہیں ہے؟ عدالت بھی کسی مجرم کو سزا دیتی ہے تو اس پر فردِ جرم لگا دیتی ہے۔ آپ نے اتنی عنایت بھی نہ کی۔ مجھے خطا معلوم ہو جاتی تو آیندہ کے لئے سنبھل جاتی۔ میں آپ کے پیروں پر گر کر

اپنی خطائیں معاف کراتی ہیں آپ سے حلفاً کہتی ہوں مجھے کچھ نہیں معلوم مجھ سے کیا خطا سرزد ہوئی، ممکن ہے آپ نے اپنی بیوی میں جن اوصاف کے دیکھنے کی تمنا کی ہو وہ مجھ میں نہ ہوں۔ بیشک میں انگریزی بہت کم پڑھی ہوں۔ میں انگریزی سوسائٹی کے آداب و قواعد سے واقف نہیں۔ میں اپنی خامیوں سے ناواقف نہیں ہوں۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں آپ کے لائق نہ تھی۔ آپ کو مجھ سے کہیں زیادہ حسین اور باسلیقہ اور روشن طبع نازنین ملنی چاہئے تھی۔ لیکن سزا خطاؤں کی ملنی چاہیئے نہ کہ خامیوں کی۔ پھر میں تو آپ کے اشارے پر چلنے کو تیار ہوں، آپ میری دلجوئی کریں۔ پھر دیکھئے میں اپنی خامیوں کو کتنی جلدی پورا کرلیتی ہوں۔ آپ کی نگاہِ محبت مجھے چمکا دیگی۔ میرے ذہن کو جولاں کردے گی۔ مجھ میں قوت بیان پیدا کردیگی۔ میرے لئے نگاہِ معجزہ ثابت ہوگی۔ مگر میرے پیارے آقا، آپ کی یہ بے رحمی میرے دل و دماغ کو فنا کئے ڈالتی ہے۔ میرا دل بہت کمزور ہے۔ میں اس عتاب کی متحمل نہیں ہوسکتی اور کیا عرض کروں۔ براہِ کرم ایک روز کے لئے چلے آئیے۔ ایک بے گناہ کو رُلا کر آپ کو حسرت کے سوا کچھ نہ ہاتھ آئیگا مجھ میں سو عیب ہوں مگر مجھے دعویٰ ہے کہ آپ کی جو خدمت میں کرسکتی ہوں، حقیقی پرستش میں کرسکتی ہوں وہ کوئی دوسری عورت نہیں کرسکتی ہے، آپ عالم و فاضل ہیں۔ طبع نسانی کے ماہر ہیں۔ بیدار مغز ہیں۔ آپ کی لونڈی آپ کے روبرو کھڑی نگاہِ کرم کی بھیک مانگ رہی ہے۔ کیا اس کے سوال کو ٹھکرا دیجئے گا؟

آپ کی خطادار

"کسم"

میں یہ خط پڑھ کر بے انتہا متاثر ہوا مجھے اس خیال سے اشتعال پیدا ہوا کہ ایک حسینہ اپنے شوہر کے روبرو اتنا عجز و انکسار کیوں کرے۔ مرد کو اگر عتاب کی آزادی ہے تو عورت کو وہ آزادی کیوں نہیں۔ یہ ظالم سمجھتا ہے کہ شادی نے ایک عورت کو غلام بنا دیا۔ وہ اس کے ساتھ جتنا چاہے ظلم کرے کوئی اس سے باز پرس نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی دوسری تیسری شادی کر سکتا ہے۔ عورت سے کوئی تعلق نہ رکھ کر اس پر اسی سختی سے حکومت کر سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ عورت پا بندیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اسے رو رو کر مر جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اگر اسے خوف ہوتا کہ عورت بھی اس کی اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں اینٹ سے بھی نہیں محض تھپڑ سے دے سکتی ہے۔ تو اسے کبھی اس بد مزاجی کی جرأت نہ ہوتی۔ غریب عورت کتنی مجبور ہے! شاید میں کسی کی جگہ ہوتا تو اس کی بے اعتنائی کا جواب اس کی وہ چند بے نیازی سے دیتا۔ میں اس کی چھاتی پر مونگ دلتا۔ زمانہ کے ہنسنے کی مطلق پرواہ نہ کرتا۔ جو زمانہ اتنا ظلم روا رکھ سکتا ہے اور زبان احتیاج نہیں کھولتا اس کے ہنسنے اور رونے کی مجھے مطلق پرواہ نہ ہوتی یہ وہ زمانہ ہے جس کی یاد شیریں زندگی میں مٹھاس پیدا کر دیتی ہے، جس کے ایک ایک دن پر ایک ایک عمر قربان کی جا سکتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے۔ جب مرد عورت پر نثار ہوتا ہے، اس کی پرستش کرتا ہے اور عورت کے دل پر اتنا پائدار نقش مرتسم کر دیتا ہے کہ وہ اس کے سارے مظالم کو ہنس کر برداشت کرتی ہوئی اس کی خدمت میں عمر گزار دیتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب الفت کی بہار آتی ہے اور دلوں میں نئی نئی کونپلیں نکلنے لگتی ہیں۔ اس موسم میں کون ایسا بے رحم ہے کہ درختوں پر تیر

چلائے گا۔ یہ اخلاقی جرم ہے یہ وہ زمانہ ہے جب صیاد طائر کو اس کے نشیمن سے نکال کر پنجرے میں بند کر دیتا ہے۔ کیا وہ اس کی گردن پر چھری چلا کر اس کا نغمۂ شیریں سننے کی ہوس رکھتا ہے ؟ ہاں یہ وہ زمانہ ہے جب دو مسافر منزل حیات میں باہم رفیق بن جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو آسائش پہنچانے کی ذمہ داری دونوں پر برابر ہے۔ اگر ایک جو زیادہ طاقتور ہے اپنے کمزور رفیق پر رفاقت کے پہلے ہی چند لمحوں میں رعب جمانا شروع کرے تو منزل کا خدا ہی حافظ ہے۔

پھر میں نے دوسرا خط پڑھنا شروع کیا :۔

دوسرا خط

" میرے سرتاج ! دو ہفتے تک جواب کا انتظار کرنے کے بعد آج پھر یہ شکوہ نامہ لکھنے بیٹھتی ہوں جس وقت میں نے وہ خط لکھا تھا میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس کا جواب ضرور آئیگا۔ اُمید کے خلاف اُمید کر رہی تھی۔ میرا دل اب بھی اسے قبول نہیں کرتا کہ آپ نے عمداً جواب نہیں دیا۔ غالباً آپ کو فرصت نہیں ملی۔ یا خدانخواستہ آپکی طبیعت تو ناساز نہیں ہے۔ کس سے پوچھوں ؟ اس خیال سے ہی میرا دل کانپتا ہے۔ میری ایشور سے یہی التجا ہے کہ آپ خوش و خرم ہوں۔ مجھے خط نہ لکھیں نہ سہی۔ میں رو کر خاموش ہی تو ہو جاؤنگی۔ آپ کو خدا کا واسطہ ہے۔ اگر آپ کی طبیعت ذرا بھی مضمحل ہو تو مجھے فوراً خط لکھئے میں کسی کو ہمراہ لیکر آؤنگی۔ تکلف اور رواج سے میری طبیعت گھبراتی ہے۔ ایسی حالت میں بھی اگر آپ مجھے اپنی خدمت سے محروم رکھتے ہیں تو آپ میرا وہ حق مجھ سے چھین رہے ہیں جو میری زندگی کی سب سے عزیز چیز ہے۔

سے ہے ۔ میں آپ سے اور کوئی درخواست نہیں کرتی ۔ آپ مجھے موٹے سے موٹا کھلایئے ۔ موٹے سے موٹا پہنایئے ۔ مجھے ذرا بھی شکایت نہ ہوگی ۔ آپ کے ساتھ میں بڑی سی بڑی مصیبت میں بھی خوش رہوں گی ۔ مجھے زیور کی ہوس نہیں ۔ محل میں رہنے کی تمنا نہیں ۔ سیر تماشے کا شوق نہیں ۔ میری زندگی کا منشا آپ کی خدمت ہے ۔ یہی اس کا ماحصل ہے ۔ میرے دُنیا میں کوئی دیوتا نہیں ، کوئی گورُو نہیں ، کوئی حاکم نہیں ۔ میرے دیوتا ، آپ ہیں ، میرے گرُو آپ ہیں ، میرے حاکم آپ ہیں ، مجھے اپنے قدموں سے جُدا نہ کیجئے ۔ مجھے ٹھکرایئے نہیں ۔ میں محبّت اور خدمت کے پھُول لئے عصمت اور وفا کی نذر دامن میں بھرے ، پجارن کی طرح آپ کی خدمت میں حاضر ہوں ۔ مجھے ان پھولوں کو اس نذر کو اپنے قدموں پر رکھنے دیجئے ۔ پجارن کا کام تو پوجا کرنا ہے ۔ دیوتا اس کی پوجا قبول کرتا ہے یا نہیں ۔ یہ سوچنے کی اُسے کہاں فرصت ہے ۔ میرے آقا ! شاید آپ کو معلوم نہیں میری آج کل کیا کیفیت ہے ۔ اگر معلوم ہوتا تو آپ ہرگز اس سرد مہری کا برتاؤ نہ کرتے ۔ آپ مرد ہیں آپ کے دل میں رحم ہے ۔ وسعت ہے ۔ دادرسی ہے ۔ میں یہ باور نہیں کر سکتی کہ آپ مجھ جیسی ناچیز پر غصہ کر سکتے ہیں ۔ میں آپ کے رحم کے لائق ہوں ۔ کتنی نحیف ، کتنی بے زبان ، کتنی حقیر آپ آفتاب ہیں ۔ میں ذرہ ہوں ، آپ شعلہ ہیں ، میں حُسن ہوں ، آپ راجہ ہیں ، میں بھکارن ہوں ۔ غصہ تو برابر والوں پر آتا ہے میں آپ کے غصہ کی متحمل نہیں ہو سکتی ۔ اگر آپ سمجھتے ہیں میری آپ کو کوئی ضرورت نہیں ہے تو مجھے اپنے ہاتھوں سے زہر کا پیالہ دیدیجئے ۔ میں اُسے آبِ حیات کی طرح سر اور آنکھوں سے لگاؤں گی ، اور آنکھیں بند کر کے پی جاؤں گی مجھے یہ .. کافی ہے کہ میری

موت سے آپ کو بے فکری ہوئی۔ زندگی جب آپ کی نذر ہو گئی تو اسے ماریں یا زندہ رکھیں، یہ آپکی خوشی ہے میں تو اتنا ہی جانتی ہوں کہ میں آپ کی ہوں اور ہمیشہ آپ کی رہوں گی۔ اس جنم میں ہی نہیں آیندہ جنموں میں بلکہ ابد تک؛

آپ کی بدنصیب "کُسم"

مجھے یہ خط پڑھ کر کُسم پر غصّہ آنے لگا اور اس لونڈے سے نفرت ہوگئی۔ مانا کہ تم عورت ہو، اور حال کے رواج کے مطابق مرد کو تمھارے اوپر ہر طرح کا اختیار ہے۔ لیکن اس حد تک انکسار کیا معنی! عورت کو خود دار ہونا چاہیئے۔ اگر مرد اس سے بے اعتنائی کرتا ہے تو اُسے بھی چاہیئے کہ اس کی بات نہ پوچھے۔ عورتوں کو دھرم فرض اور تیاگ کا سبق پڑھا پڑھا کر ہم نے ان کی خودداری اور خود اعتمادی دونوں ہی کا خاتمہ کر دیا۔ اگر مَرد عورت کا محتاج نہیں، تو عورت مَرد کی محتاج کیوں ہو؟ ایشور نے مَرد کو ہاتھ دیئے ہیں تو کیا عورت کو اُن سے محروم رکھا ہے۔ مَرد کے دماغ ہے تو کیا عورت خالی الذہن ہے۔ اس انکسار نے تو مَردوں کا مزاج آسمان پر پہنچا دیا۔ مَرد روٹھ گیا تو گویا قیامت آگئی۔ میں تو سمجھتا ہوں عورت نہیں وہ مرد رحم کے قابل ہے جو کُسم جیسی وفا کی دیوی کی قدر نہیں کر سکتا۔ مجھے ایسا شک ہونے لگا کہ اس لونڈے نے کوئی دوسرا ہی مرض پال رکھا ہے کسی صیّاد کے رنگین جال میں گرفتار ہو گیا ہوگا۔ خیر میں نے تیسرا خط کھولا اور پڑھنے لگا:۔

تیسرا خط

میرے دل و جان کے مالک! اب مجھے معلوم ہو گیا کہ میرا زندہ رہنا بے سُود

ہے۔ جس پُھول کو دیکھنے والا، چُننے والا کوئی نہیں وہ کِھل کر کیا کرے۔ میں آپ کے گھر ایک مہینہ رہ کر دوبارہ آئی ہوں، سُسر جی نے مجھے بلایا۔ انھیں نے مجھے رخصت کر دیا۔ ! اس دوران میں آپ نے ایک بار بھی مجھے درشن نہ دیئے۔ آپ دن میں بیسیوں ہی مرتبہ گھر میں آتے تھے۔ اپنے بہن بھائیوں سے ہنستے بولتے تھے۔ یار دوستوں کے ساتھ سیر کرتے تھے۔ لیکن میرے پاس آنے کی آپ نے قسم کھالی تھی میں نے آپ کو کتنی بار آپ کے پاس کتنے رقعے بھیجے، کتنی منتیں کیں، کتنی بار بےشرمی کرکے آپ کے کمرے میں گئی۔ لیکن آپ نے کبھی مجھے آنکھ اُٹھاکر بھی نہ دیکھا۔ میں تو قیاس بھی نہیں کر سکتی کہ کوئی انسان اتنا سنگدل ہوسکتا ہے۔ میں محبت کے قابل نہیں، اعتبار کے قابل نہیں، خدمت کے قابل نہیں، کیا رحم کے قابل بھی نہیں، میں نے اس دن کتنی محنت سے آپ کے لئے رس گلّے بنائے تھے۔ آپ نے انھیں چُھوا بھی نہیں۔ جب آپ مجھ سے اس قدر برداشتہ خاطر ہیں تو میں نہیں سمجھتی کہ زندہ رہ کر کیا کروں نہ جانے وہ کونسی اُمید ہے جو مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے، کیا ستم ہے کہ آپ سزا دیتے ہیں۔ مگر جرم نہیں بتلاتے۔ یہ کونسا انصاف ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ اس ایک ماہ کے قیام میں میں نے مشکل سے آپ کے یہاں دس دن کھانا کھایا ہوگا۔ میں کمزور ہوگئی ہوں کہ چلتی ہوں تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ آنکھوں میں گویا بینائی نہیں رہی۔ دل میں گویا خون کی گردش ہی نہیں رہی۔ خیر ستا لیجئے جتنا جی چاہے رُلا لیجئے، جتنا جی چاہے۔ اس ستم کی بھی ایک دن انتہا ہو جائے گی۔ اب تو موت ہی پر ساری اُمیدیں قائم ہیں۔ میں جانتی ہوں میری موت کی خبر پاکر آپ مسکرائیں گے۔ آپکی آنکھوں سے آنسو کی ایک بوند بھی نہ گرے گی۔ مگر آپ کی کوئی خطا نہیں یہ میری

بدنصیبی ہے۔ میرے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ اُس جنم میں کوئی بہت بڑا گناہ کیا تھا۔ میں چاہتی ہوں، میں بھی آپ کی پرواہ نہ کروں۔ آپ ہی کی طرح آپ سے بے التفاتی کروں لیکن نہ جانے کیوں میں اپنے میں وہ طاقت نہیں پاتی۔ تنہا درخت کی طرح کھڑی رہ سکتی ہے۔ درخت کے لئے کسی سہارے کی ضرورت نہیں وہ قوت کہاں سے لائے وہ تو درخت سے لپٹنے کے لئے پیدا کی گئی ہے اُسے درخت سے الگ کرو تو وہ خشک ہو جائیگی۔ میں آپ سے علیحدہ اپنی ہستی کا خیال ہی نہیں کر سکتی۔ میری زندگی کے ہر فعل ہر خیال، ہر آرزو میں آپ موجود ہوتے ہیں۔ میری زندگی ایک دائرہ ہے جس کے مرکز آپ ہیں۔ میں وہ ہار ہوں جس کے ہر پھول میں آپ ہی دھاگے کی طرح پیوست ہو گئے ہیں۔ اس دھاگے کے بغیر ہار کے پھول بکھر جائیں گے۔ اور خاک میں مل جائینگے۔

میری ایک سہیلی کی امسال ہی شادی ہوئی ہے۔ اس کا شوہر جس وقت سسرال آتا ہے۔ شنو کے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے دن میں کتنے روپ بدلتی ہے، کہہ نہیں سکتی۔ چہرہ کھل جاتا ہے۔ مسرت سنبھالے میں نہیں آتی۔ اُسے بکھیرتی لٹاتی چلتی ہے ہم جیسے بدنصیبوں کے لئے۔ آکر گلے لپٹ جاتی ہے اور اس کے منہ سے خوشیوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے اخلاص اور وفا میں متوالے ہوئے ہیں۔ اُن کے پاس دولت نہیں ہے، جائداد نہیں ہے۔ مگر اپنی بے سروسامانی میں خوش ہیں۔ اس لازوال محبت کا ایک لمحہ ساری دنیا کی دولت سے بیش قیمت ہے۔ میں جانتی ہوں یہ بے فکریاں اور رنگ رلیاں بہت دن نہ رہیں گی۔ افکار، حوادث روزگار ان کی زندگی کو بھی پامال کر دیں گے۔ لیکن اس دور محبت کی یادگاریں، اُن کے دل کو ہمیشہ تقویت دیتی رہیں گی۔ محبت میں

بھیگی ہوئی روکھی روٹیاں، اور محبّت میں رنگے ہوئے موٹے کپڑے اور محبت کی روشنی سے نورانی چھوٹا سا حجرہ اپنی بے نوائی میں بھی وہ حلاوت اور وہ برکت اور وہ زیبائش رکھتا ہے۔ جو شاید دیوتاؤں کو جنّت میں نصیب نہیں، جب شنتو کا شوہر اپنے گھر چلا جاتا ہے تو وہ دُکھیا کس طرح پُھوٹ پُھوٹ کر روتی ہے اس کے خطوط آجاتے ہیں تو گویا اسے کہیں کی نعمت مل جاتی ہے اس کے آنسو اضطراب اور اشتیاق کے آنسو ہیں۔ میرے آنسو مایوسی اور غم کے آنسو ہیں۔ اسکی بیتابیاں انتظار اور شوق کی بیتابیاں ہیں۔ میری بیتابیاں پامالی اور کس مپرسی کی بیتابیاں ہیں۔ اسکے شکوہ میں قبضہ اور اپنا پن ہے۔ میرے شکوے میں دل شکستگی اور بے دست و پائی ہے۔ اُس شوق اور انتظار اور درد کی کیفیتوں میں انکی مسرّت کا راز پوشیدہ ہے۔ میں اِن کیفیتوں سے محروم ہوں۔

خط لمبا ہوا جاتا ہے اور دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوتا۔ بڑی شدّت کی گرمی پڑ رہی ہے۔ دادا مجھے منصوری لے جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ میری لاغری اور خستہ حالی سے انہیں شاید شک ہو رہا ہے کہ میں ٹی۔ بی کا شکار ہوں۔ میرے لئے منصوری ہی نہیں، جنّت بھی وادیٔ غم ہے۔“

آپکی حسرت زدہ ”کُسم“

چوتھا خط

میرے پتھر کے دیوتا! کل منصوری سے لوٹ آئی۔ لوگ کہتے ہیں بڑی پُرفضا جگہ ہے ہوگی، میں تو ایک دن بھی کمرے سے باہر نہیں نکلی، مُردہ دلوں کے لئے دُنیا ویران ہے۔ میں نے رات کو ایک پُرنشاط خواب دیکھا۔ بتاؤں، مگر کیا فائدہ نہ جانے

کیوں میں اب بھی مَوت سے ڈرتی ہوں ۔ اُمید کا کچا دھاگا مجھے اب بھی زندگی سے باندھے ہوئے ہے ۔ باغ زندگی کے دروازے پر آ کر بغیر سیر کئے لوٹ جانا کتنا حسرتناک ہے ۔ اندر کیا کیا بہاریں ہیں ۔ کیا کیا نغمے ہیں ۔ کیا کیا دلفریبیاں ہیں ۔ میرے لئے وہ دروازہ بند ہے کتنی آرزوں سے سیر کا لُطف اُٹھانے چلی تھی ۔ کتنی تیاریوں سے مگر میرے پہنچتے ہی دروازہ بند ہو گیا ۔

اچھا بتلاؤ ؟ میں مَرجاؤنگی ۔ تو میری میّت پر دو بوندیں آنسو کی گراؤ گے ؟ جس کی زندگی بھر کی ذمہ داری لی تھی ۔ جس کی ہمیشہ کے لئے بانہہ پکڑی تھی ۔ کیا اسکے ساتھ اتنی بھی فیاضی نہ کرو گے ۔ مرنے والوں کی خطائیں سب معاف کر دیا کرتے ہیں تم بھی معاف کر دینا ۔ آ کر میری لاش کو اپنے ہاتھوں سے نہلانا ۔ اپنے ہاتھ سے سُہاگ کا سیندور لگانا ۔ اپنے ہاتھ سے سُہاگ کی چوڑیاں پہنانا ۔ اپنے ہاتھ سے میرے منہ میں گنگا جل ڈالنا ۔ چار قدم کے لئے کندھا دے دینا ۔ میری رُوح خوش ہو جائے گی ، اور تمھیں دُعائیں دے گی ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ایشور کے دربار میں تمھارا جشن گاؤں گی ۔ کیا یہ بھی مہنگا سودا ہے ؟ اتنی سی ظاہرداری کر کے تم اپنے سارے فرائضِ شوہری سے سبکدوش ہوئے جاتے ہو ۔ کاش مجھے اس کا یقین ہوتا تو میں کتنی خوشی سے مرتی ۔ کتنی خوشی سے موت کا خیر مقدم کرتی ! لیکن میں تمھارے ساتھ اتنی بے انصافی نہ کروں گی ۔ تم ہزار سنگدل ہو ۔ اتنے بے رحم نہیں ہو سکتے ۔ میں جانتی ہوں تم خبر پا کر آؤ گے ۔ اور شاید ایک لمحہ کے لئے میری مرگ حسرت پر تمھاری آنکھیں رو پڑیں ۔ آہ کاش میں اپنی زندگی میں وہ نظارہ دیکھ سکتی ۔

اچھا کیا میں ایک سوال پُوچھ سکتی ہوں ، ناراض نہ ہونا ۔ کیا میری جگہ

کسی اور نے لے لی ہے ؟ اگر ایسا ہے تو مُبارک ! ذرا اس کی تصویر میرے پاس بھیج دینا۔ میں اُسکی پُوجا کرونگی۔ اُس کے قدموں کو بوسہ دونگی۔ میں جس پتھر کے دیوتا کو نہ پگھلا سکی۔ اُس سے اُس نے بردان پایا۔ ایسی خوش نصیب عورت کے قدم دھو دھو کر پیونگی۔ میرے دل سے دُعا ہے کہ تم اُس کے ساتھ آرام سے زندگی بسر کرو۔ کاش میں اُس کی خدمت کر سکتی۔ بے واسطہ نہیں، بالواسطہ تمھارے ساتھ اپنا کچھ فرض ادا کر دیتی۔ تم مجھے صرف اس کا نام اور پتہ بتا دو۔ میں سر کے بل دوڑی ہوئی اُس کے پاس جاؤنگی۔ اور کہونگی، دیوی میں تمھاری کنیز ہوں، اس لئے کہ تم میرے مالک کی منظورِ نظر ہو مجھے اپنے قدموں میں جگہ دو میں تمھارے لئے پھولوں کی سیج بچھاؤں گی۔ تمھارے گیسوؤں کو موتیوں سے گوندھوں گی، تمھارے ماتھے پر سُہاگ کا ٹیکہ لگاؤں گی، تمھاری ایڑیوں مہاور چوں گی، یہی میرا مقصد حیات ہوگا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں جلوں گی یا کُڑھونگی، جلن اس وقت ہوتی ہے، جب کوئی مجھ سے میری چیز چھین رہا ہو، جس چیز کو اپنا سمجھنے کا مجھے کبھی موقع ہی نہ ملا اس کے لئے مجھے کیوں جلن ہو۔ ابھی بہت کچھ لکھنا تھا لیکن۔ ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں۔ غریب مرض کو ٹی۔ بی۔ سمجھ رہا ہے۔"

آپکی حسرت نصیب۔ "کُسم"

ان دونوں خطوں نے ذرا دیر کے لئے مجھ پر جنوں کا عالم طاری کر دیا۔ میں بھی سلامت پسند آدمی ہوں۔ میرے جذبات جلد ہیجان میں نہیں آتے، اکثر ادیبوں کی طرح میں بھی الفاظ سے متاثر نہیں ہوتا۔ کیا چیز دل سے نکلی ہے۔ کیا چیز محض تاثیر کے لئے لکھی گئی ہے، اس کا لطف اکثر افسانوں میں خارج ہو جاتا ہے لیکن ان خطوط نے مجھے از خود رفتہ بنا دیا۔ ایک جگہ تو واقعی میری آنکھیں آب گوں

ہوگئیں ۔ یہ خیال کتنا رُوح فرسا تھا کہ نازونعم میں پلی ہوئی کُسم جسے ماں باپ دونوں اپنی آنکھوں سے زیادہ پیار کرتے تھے ۔ شادی ہوتے ہی یکایک اتنی بیکس و مجبور ہو۔ شادی کیا ہوئی ۔ اس کی چتا تیار ہوئی یا اس کے قتل کا پروانہ لکھا گیا ۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے دردناک سانحہ زیادہ نہیں ہوتے ۔ لیکن اُن کا امکان تو رہتا ہے ۔ جب تک ہر دو فریق کے حقوق و اختیار و فرائض مساوی نہ ہوں ایسے سانحے ہمیشہ ہوتے رہیں گے ۔ زبردست کو ستانا شاید انسانی خاصہ ہے ۔ کاٹنے والے کُتے سے لوگ دُور بھاگتے ہیں ۔ سیدھے کتے پر لونڈے تفریح کے لئے پتھر پھینکتے ہیں ۔ لیکن آج ان میں سے ایک کو افسر اور دوسرے کو اس کا ماتحت بنا دو ۔ پھر دیکھو افسر صاحب اپنے ماتحت پر کتنا رُعب جماتے ہیں ۔ موجودہ حالات میں بیوی بننا غلامی نہ سہی ، مرد سے کمتر درجہ قبول کرنا ہے ۔ محبت تو مساوات تامہ کا نام ہے ۔ اس ناہمواری میں محبت کا وجود ہو سکتا ہے ۔ مجھے تو اس میں بھی شک ہے ۔ ہم آج جسے محبت کہتے ہیں وہ فی الواقع وہی محبت ہے ۔ جو جانور کو اپنے آقا سے ہو سکتی ہے ۔ جانور سر جھکائے کام کئے چلا جائے ۔ مالک اُسے بھوسا اور کھلی بھی دیگا ۔ اس کا بدن بھی سہلائے گا ۔ اُس کو زیورات سے آراستہ بھی کرے گا ۔ لیکن جانور نے ذرا رفتار سست کی ۔ ذرا گردن ٹیڑھی کی اور مالک کی قمچی پیٹھ پر پڑی ۔ یہ محبت نہیں ہے ۔ ہرگز نہیں ۔

خیر میں نے پانچواں خط لکھوا :-

پانچواںؑ خط

"جیسا مجھے یقین تھا آپ نے میرے پچھلے خط کا جواب بھی نہ دیا ۔ اس کے معنی

یہ ہیں کہ آپ نے مجھے ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے جیسی آپکی مرضی۔ مردوں کے لئے بیوی پیر کی جوتی ہو، عورت کے لئے مرد دیوتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بلوغ و شعور کے ساتھ ہی وہ شوہر کے نام پر بک جاتی ہے جسوقت میں گڑیاں کھیلتی تھی اُسی وقت آپ نے گڈے کے رُوپ میں میرے خانۂ دل میں قدم رکھا۔ میں نے آپ کے قدموں کو نکھارا۔ مالا پھول اور بتاشے سے آپ کی تواضع کی۔ پھر آپ کہانیوں کے راجہ کے روپ میں میرے گھر آئے، میں نے آپ کو دل میں جگہ دی۔ آپ کے خونریز معرکوں میں آپ کی ہیبت رہ نوردیوں میں آپ کے ساتھ رہی۔ ایام طفلی سے ابتک آپ کسی نہ کسی صورت میں میرے دل میں موجود تھے۔ وہ جذبات میرے قلب کی گہرائیوں تک پہنچ گئے ہیں۔ میرے وجود کا ایک ایک ذرہ ان کی پرورش کرتا رہا ہے۔ انھیں دل سے نکال ڈالنا آسان نہیں ہے۔ اس کے ساتھ میری ہستی کے ریزے بھی منتشر ہو جائیں گے لیکن آپ کی مرضی ہے تو یہی سہی۔ میں آپ کی خدمت میں سب کچھ کرنے کو آمادہ تھی عُسرت اور تنگی کا تو ذکر ہی کیا۔ میں اپنے کو فنا کر دینے کو تیار تھی، آپ کی خدمت میں فنا ہو جانا۔ یہی میری زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد تھا۔ میں نے شرم و حیا کو خیرباد کہا۔ خودداری کو پیروں سے کچلا۔ لیکن آپ کو منظور نہیں ہے۔ مجبور ہوں۔ آپ کی کوئی خطا نہیں ضرور مجھ سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوا ہے، جسے آپ زبان پر نہیں لانا چاہتے۔ میں اس بے اعتنائی کے سوا اور ہر ایک سزا جھیلنے کو تیار تھی۔ آپ کے ہاتھ سے زہر کا پیالہ لیکر پی جانے میں بھی مجھے کوئی تامل نہ ہوتا۔ مگر نوشتۂ تقدیر سے کیا چارہ آپ میرے خطوط واپس کر دیں، یہی میری آخری التجا ہے۔ یہ زیور اور بیش قیمت جوڑے میرے کس کام کے انھیں اپنے پاس رکھنے کا مجھے کوئی حق نہیں، آپ انھیں جس وقت چاہیں واپس

منگوالیں۔ میں نے انھیں ایک صندوق میں بند کرکے الگ رکھ دیا ہے۔ انکی فہرست بھی صندوق میں ہے، ملا لیجئے گا۔ آج سے آپ میری زبان اور قلم سے کوئی شکایت نہ سنیں گے۔ اس خیال کو بھول کر دل میں جگہ نہ دیجئے گا۔ کہ میں آپ سے بیوفائی کروں گی۔ میں اسی گھر میں کڑھ کڑھ کر مرجاؤں گی۔ مگر آپ کی جانب سے خیال فاسد میرے دل میں نہ آئے گا۔ میں آپ کے ناموس کی امین ہوں۔ اس امانت میں تادم زیست خیانت نہ ہوگی۔ اگر میرے امکان میں ہوتا تو میں اسے واپس کردیتی لیکن میں بھی مجبور ہوں اور آپ بھی مجبور ہیں۔ میری ایشور سے یہی دعا ہے کہ آپ جہاں رہیں خوش آباد رہیں۔ زندگی میں مجھے سب سے جگر سوز یہی تجربہ ہوا کہ عورت کی زندگی لعنت ہے۔ اپنے لئے اپنے والدین کے لئے اپنے خاندان کے لئے۔ اس کی قدر نہ والدین کے گھر میں ہے، نہ شوہر کے گھر میں۔ میرا گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہے۔ اماں رو رہی ہیں، دادا رو رہے ہیں۔ عزیز بیگانے رو رہے ہیں۔ ساری دنیا ایک طرف ہو جائے، آپ سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ یہاں آپ کا فیصلہ ناطق ہے۔ اس کی کہیں اپیل نہیں۔ کہیں فریاد نہیں، خیر آج سے یہ قصہ زندگی تمام ہوا۔ اب میں ہوں اور میرا پامال دل۔ حسرت یہی ہے کہ آپ کی کچھ خدمت نہ کرسکی"

بدنصیب "کسم"

(۱۳)

معلوم نہیں میں کتنی دیر تک عالم سکوت میں بیٹھا رہا کہ حضرت شاطر نے فرمایا:۔

"آپ نے ان خطوط کو پڑھ کر کیا رائے قائم کی؟"

میں نے ملامت آمیز لہجہ میں کہا "اگر ان خطوط نے اس ظالم کے دل پر اثر نہیں کیا تو میرا خط بھلا اس پر کیا اثر کرے گا۔ ان سے زیادہ دردناک اور پُرتاثیر تحریر میرے امکان سے باہر ہے۔ ایسا کونسا انسانی جذبہ ہے جسے ان خطوط میں متحرک نہ کیا گیا ہو۔ غیرت، رحم، درد، میرے خیال میں تو اُس نے کوئی پہلو نہیں چھوڑا۔ میرے لئے تو آخری تدبیر یہی ہے کہ اس شیطان کے سر پر سوار ہو جاؤں اور اس سے دو بدو گفتگو کرکے معاملہ کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کروں۔ اگر اُس نے مجھے کوئی قابلِ اطمینان جواب نہ دیا تو میں اپنا اور اُس کا خون ایک کردوں گا۔ یا تو مجھے پھانسی ہوگی، یا وہی کالے پانی جائیگا۔ کُسم نے جتنا تحمل کیا ہے اُس پر مجھے حیرت ہوتی ہے، آپ زیادہ پریشان نہ ہوں اطمینان سے گھر واپس جائیں۔ میں آج رات کی گاڑی سے جاؤں گا اور پرسوں تک جو صورت حال ہوگی۔ اس کی آپ کو اطلاع دوں گا۔ مجھے یہ کوئی انتہا درجہ کا خبیث النفس آدمی معلوم ہوتا ہے، صورت اور سیرت میں اتنا تفاوت میں نے پہلی بار دیکھا، ظالم سمجھتا ہوگا۔ کُسم اس کے قابل نہیں کیونکہ وہ نمائش اور تصنع نہیں جانتی، میں ایسے ایسے ایک ہزار لونڈوں پر نثار کردوں۔

میں بہک میں نہ جانے کیا کیا بکتا رہا۔ اس کے بعد ہم دونوں کھانا کھاکر اسٹیشن چلے، وہ آگرہ گئے: میں نے مُرادآباد کا راستہ لیا۔ شاطر صاحب کی رُوح اس وقت بھی فنا ہو رہی تھی کہ میں غصہ میں کوئی بے عنوانی نہ کر بیٹھوں بارے میرے بہت اطمینان دلانے پر انھیں تشفی ہوئی۔

میں علی الصباح مرادآباد پہنچا اور تفتیش شروع کردی۔ ان حضرت کے اطوار کے متعلق مجھے جو شبہ تھا وہ غلط نکلا۔ محلہ میں، کالج میں، اس کے دوستوں

میں سبھی اس کے مداح تھے۔ معاملہ زیادہ پیچیدہ ہوتا ہوا معلوم ہوا آخر شام کو میں اس کے گھر جا پہنچا اور اس کے والد سے ملنا بے سُود سمجھ کر براہ راست اُس سے ملا جس سعادتمندانہ اخلاص سے وہ مجھ سے ملا ہے اُسے بھُول نہیں سکتا۔ نہایت شائستہ انداز کلام تھا۔ مزاج میں حد درجہ انکسار ہیں نے دو چار تمہیدی جملوں کے بعد پُوچھا۔ تم سے مِل کر مجھے کمال مسرت ہوئی۔ لیکن آخر تُم نے کیا خطا کی ہے جس کی تم اُسے ایسی سخت سزا دے رہے ہو۔ اُس غریب نے تمھارے پاس کئی خط لکھے تم نے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ وہ دو تین بار یہاں بھی آئی۔ مگر تم اُس سے مخاطب نہ ہوئے۔ کیا یہ اس معصوم کے ساتھ تمھاری بے انصافی نہیں ہے؟"

نوجوان نے ندامت آمیز انداز سے کہا" بہتر ہوتا کہ آپ نے اس مسئلہ کو نہ چھیڑا ہوتا۔ اس کا جواب دینا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ میں نے تو اُسے آپ صاحبوں کے قیافہ پر چھوڑ دیا تھا۔ اور سمجھتا تھا کہ مجھے اظہار حال کی ضرورت نہ پڑے گی۔ لیکن غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں، اس لئے اب مجھے مجبوراً عرض کرنا پڑیگا ممکن ہے آپ مجھے انتہا درجہ خود پرور، کمینہ، حریص سمجھیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میری شادی نے وہ تمنا نہ پوری کی جو مجھے جان سے زیادہ تھی۔ میں شادی کرنے پر رضامند نہ تھا۔ اپنے پیروں میں زنجیر نہ ڈالنا چاہتا تھا۔ لیکن جب جناب شاطر صاحب بہت درپے ہوئے اور ان کی باتوں سے مجھے یہ گمان کرنے کا موقعہ ملا کہ وہ میری ہر ممکن صورت سے امداد کرنے کو آمادہ ہیں تو میں رضامند ہو گیا۔ مگر اُنھوں نے میری مطلق امداد نہ کی۔ انکی بے اعتنائی نے میری زندگی کے سارے خواب پریشان کر دئیے۔ میرے لئے اب بجز اس کے اور کیا ہے کہ ایل، ایل بی

پاس کروں اور عدالت میں جوتیاں چٹخاتا پھروں"

میں نے پوچھا۔" تو تم حضرت شاطر سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو۔ اداو دہش میں تو انھوں نے شکایت کا موقعہ نہ دیا"

نوجوان نے سر جھکا کر کہا۔" اس داد و دہش سے میرا کیا ذاتی فائدہ ہوا۔ طرفین کے دس بارہ ہزار روپے خاک میں مل گئے۔ اور انھیں کے ساتھ میری آرزوئیں بھی خاک میں مل گئیں۔ والد صاحب تو مقروض ہو گئے ہیں۔ اور اب میری تعلیم کے بار کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے۔ میں بیکار کے طور پر ایل ایل، بی، کلاس میں شریک ہو گیا ہوں۔ کیا خسر صاحب مجھے انگلینڈ نہ بھیج سکتے تھے، اُن کے لئے دس پانچ ہزار روپے کوئی حقیقت نہیں رکھتے"

میں سکتے میں آگیا۔ میرے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا" لاحول ولاقوۃ" ان صاحبزادے کا جتنا وقار میری نظروں میں قایم ہو گیا تھا وہ جھوٹے رنگ کی طرح اُڑ گیا۔ واہ ری دنیا! واہ رے ہندو سماج! تیرے یہاں ایسے دُنیا پرست پڑے ہوئے ہیں جو ایسے ظالمانہ وحشیانہ دباؤ ڈال کر، ایک معصوم زندگی کو تباہ کر کے منصب حاصل کرنا چاہتے ہیں تحصیل کے لئے انگلینڈ یا امریکہ جانا بُرا نہیں۔ خدا توفیق دے تو شوق سے جاؤ۔ مگر بیوی کو ترک کر کے خسر پر اس کا بار ڈالنا بے غیرتی کی انتہا ہے۔ تعریف کی بات تو یہ تھی کہ تم اپنے توسّط بازو سے جاتے۔ حالانکہ خود غرضانہ محبت بہت ہی معیوب ہے اور کوئی غیرت مند آدمی محبت میں غرض کو شامل نہ کریگا۔ لیکن اس وحشیانہ طرز عمل کے مقابلہ میں پھر بھی غنیمت ہے۔ کُسم کو ایک فرضی فرد گذاشت کے لئے گردن زدنی ٹھہرا دینا چھچھورے پن کی انتہا ہے۔ اس ظالم کی نگاہ

میں کُسم کی کوئی حقیقت نہیں کُسم محض آلہ ہے اس کی دنیا طلبی کا۔ ایسے پست خیال آدمی سے کچھ بحث کرنا بیکار ہے۔ میں نے سوچا اس وقت "دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ" والی پالیسی ہی اس موقعہ پر موزوں ہے۔

دوسری گاڑی سے میں آگرہ جا پہنچا۔ اور مسٹر شا طر سے یہ سرگذشت کہی۔ اُن غریب کو کیا معلوم تھا کہ یہاں ساری ذمہ داری اُنھیں کے سر ڈال دی گئی ہے۔ اگرچہ اس عام سردبازاری نے اُن کی وکالت بھی ٹھنڈی کر رکھی ہے۔ اور دو دس ہزار کا خرچ بے تکلف برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر اس صاحبزادے نے کِنا یتہً بھی ان سے کہا ہوتا تو وہ ضرور کوئی نہ کوئی انتظام کرتے۔ کُسم کے سوا دوسرا اُن کا کون بیٹھا ہوا ہے۔ اُن غریب کو تو حقیقت کا علم ہی نہ تھا۔ چنانچہ میں نے جوں ہی یہ قصہ کہا وہ بولے "چھی! اس ذرا سے معاملہ کو اس شخص نے خواہ مخواہ اتنا طول دیدیا۔ آج ہی آپ اُسے لکھدیں کہ وہ جس وقت، جہاں تحصیل کے لئے جانا چاہے شوق سے جا سکتا ہے۔ میں اس کی ساری ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ سال بھر تک ظالم نے کُسم کو رُلا رُلا کر مار ڈالا۔ عرض حال کا اس کے سوا اُسے کوئی طریقہ ہی نہ سوجھا۔"

گھر میں اس کا چرچا ہوا کُسم نے بھی ماں سے سُنا۔ معلوم ہوا کہ ایک ہزار کا چک اُس کے شوہر کے نام بھیجا جا رہا ہے۔ مگر اس طرح جیسے کوئی آئی بلا کو ٹالنے کے لئے نیاز چڑھائی جا رہی ہو۔

کُسم نے بھویں سکوڑ کر ماں سے کہا "روپیہ بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں دادا سے کہدو" ماں نے حیرت سے لڑکی کی جانب دیکھا۔ "کیسے روپئے؟ اچھا وہ کیوں؟ کیا ہرج ہے۔ لڑکے کا دل ہے تو جائے اور یوں بھی اُسی کا

ہے، ہمیں کون چھاتی پر لاد کر لے جانا ہے"

"نہیں آپ دادا سے کہہ دیجئے۔ ایک پائی بھی نہ بھیجیں"

"آخر اس میں بُرائی کیا ہے؟"

"اس لئے کہ یہ اس طرح کی ڈاکہ زنی ہے۔ جیسے بدمعاش کیا کرتے ہیں کسی آدمی کو پکڑ کر لے گئے اور اُس کے گھر والوں سے اُس کی آزادی کی ایک اچھی رقم وصول کر لیں"

ماں نے تنبیہ کی آنکھوں سے دیکھا "کیسی باتیں کرتی ہو بیٹی اتنے دنوں کے بعد تو جا کے دیوتا سیدھے ہوئے ہیں اور تم اُنھیں پھر چڑھائے دیتی ہو"

کُسم نے جھلا کر کہا "ایسے دیوتا کا روٹھے رہنا ہی اچھا۔ جو شخص اتنا دُنیا پرست اور خود غرض اور حریص ہے اُس کے ساتھ میرا نباہ نہ ہوگا۔ میں کہے دیتی ہوں اگر وہاں روپے گئے تو میں زہر کھا لوں گی۔ اِسے مذاق نہ سمجھنا۔ میں ایسے آدمی کا منہ بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ تم دادا سے کہہ دینا۔ اور اگر تمھیں ڈر لگتا ہو تو میں خود کہہ دُوں میں نے تنہا رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے"

ماں نے دیکھا لڑکی کا چہرہ تمتما اُٹھا ہے۔ گویا اس مسئلہ پر وہ اب نہ کچھ کہنا چاہتی ہے نہ سُننا۔

دوسرے دن شاطر صاحب نے یہ قصہ مجھ سے کہا تو میں ایک بیخودی کے عالم میں دوڑا ہوا کُسم کے پاس گیا اور اُسے گلے لگا لیا۔

سال بھر ہو گیا ہے، کُسم نے شوہر کے پاس ایک خط بھی نہ لکھا اور نہ اس کا ذکر ہی کرتی ہے۔ شاطر صاحب نے کئی بار اماں کو منانے کا ارادہ ظاہر کیا مگر کُسم

اُس کا نام بھی سُننا نہیں چاہتی۔ اس میں خود اعتمادی کی ایسی اسپرٹ پیدا ہوگئی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس کے چہرے پر مایوسی اور حسرت کی زردی اور بے رونقی کی جگہ خودداری اور آزادی کی سُرخی نمودار ہوگئی ہے۔

عِصمت سالگرہ نمبر ۱۹۳۲ء

اِکسیر

بیوہ ہو جانے کے بعد بوٹی کے مزاج میں کچھ تلخی آ گئی تھی۔ جب خانہ داری کی پریشانیوں سے بہت جی جلتا تو اپنے جنت نصیب کو صلواتیں سُناتی " آپ تو سدھار گئے میرے لئے یہ سارا جنجال چھوڑ گئے۔ جب اتنی جلدی جانا تھا تو شادی نہ جانے کس لئے کی تھی۔ گھر میں بھونی بھانگ نہ تھی۔ چلے تھے شادی کرنے"۔ بوٹی چاہتی تو دوسری سگائی کر لیتی، اہیروں میں اس کا رواج ہے۔ اس وقت وہ دیکھنے سُننے میں بھی بُری نہ تھی۔ دو ایک اُس کے خواستگار بھی تھے، لیکن بوٹی عفت پروری کے خیال کو نہ روک سکی اور یہ سارا غصہ اُترتا تھا۔ اس کے بڑے لڑکے موہن پر جس کا سولھواں سال تھا۔ سوہن ابھی چھوٹا تھا اور مینا لڑکی تھی۔ یہ دونوں ابھی کس لائق تھے۔ اگر یہ تین بچے اس کی چھاتی پر سوار نہ ہوتے تو کیوں اتنی تکلیف ہوتی جس کے گھر میں تھوڑا سا کام کر دیتی وہ روٹی کپڑا دے دیتا۔ جب چاہتی کسی کے گھر بیٹھ جاتی اب اگر وہ کہیں بیٹھ جائے تو لوگ یہی کہیں گے کہ تین تین بچوں کے ہوتے یہ اسے کیا سوجھی! موہن اپنی بساط کے مطابق اس کا بار ہلکا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ جانوروں کو سانی پانی ڈھونا متھنا یہ سب وہ کر لیتا۔ لیکن بوٹی کا منہ سیدھا نہ ہوتا تھا۔ روزانہ ایک نہ ایک بات نکالتی رہتی اور موہن نے بھی عاجز ہو کر اس کی تلخ نوائیوں

کی پرواہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بوٹی کو شوہر سے یہی گلہ تھا کہ وہ اس کے گلے پر گرہستی کا جنجال چھوڑ کر چلا گیا۔ اس غریب کی زندگی ہی تباہ کر دی۔ نہ کھانے کا سکھ میسر ہوا نہ پہننے کا، نہ اور کسی بات کا، وہ اس گھر میں کیا آئی گویا بھٹی میں پڑ گئی۔ اسکے ارمانوں کی تشنہ کامی اور بیوگی کے قیود میں ہمیشہ ایک جنگ سی چھڑی رہتی تھی اور جلن میں ساری مٹھاس، ساری طراوت جل کر خاک ہو گئی تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد بوٹی کے پاس اور کچھ نہیں تو چار پانچ سو کے زیور تھے۔ لیکن ایک ایک کر کے وہ سب اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اس کے محلے اس کی برادری میں کتنی ہی عورتیں ہیں، جو عمر میں اس سے بڑی ہونے کے باوجود گہنے جھمکا کر آنکھوں میں کاجل لگا کر، مانگ میں سیندور کی موٹی سی لکیر ڈال کر گویا اسے جلاتی رہتی ہیں۔ اس لئے جب اس میں سے کوئی بیوہ ہو جاتی ہے تو بوٹی کو ایک حاسدانہ مسرت ہوتی ہے۔ وہ شاید ساری دُنیا کی عورتوں کو اپنی ہی جیسی دیکھنا چاہتی تھی۔ اور اس کی محروم آرزوؤں کو اپنی پاکدامنی کی تعریف اور دوسروں کی پردہ دری اور حرف گیری کے سوا سکون قلب کا اور کیا ذریعہ تھا۔ کیسے اپنی آنسو پوچھتی! وہ چاہتی تھی، اُس کا خاندان حُسن سیرت کا نمونہ ہو۔ اس کے لڑکے ترغیبات سے بے اثر رہیں۔ یہ نیک نامی بھی اسکی پاکدامنی کے غرور کو مشتعل کرتی رہتی تھی۔

اس لئے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ موہن کے متعلق کوئی شکایت سُنے اور ضبط کر جائے۔ تردید کی گنجائش نہ تھی۔ غیبت کی اس دنیا میں رہتے رہتے وہ ایک خاص قسم کی باتوں میں بے انتہا سہل اعتقاد ہو گئی تھی، گویا وہ کوئی ایسا سہارا ڈھونڈھتی رہتی تھی جس پر چڑھ کر وہ اپنے کو دوسروں سے اونچی دکھا سکے۔ آج اس کے غرور کو

ٹھیس لگی ، موہن جونہی دو دھ بیچ کر گھر آیا بوٹی نے اُسے قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا
" دیکھتی ہوں ، اب تجھے ہوا لگ رہی ہے "

موہن اشارہ نہ سمجھ سکا ۔ پُر سوال نظروں سے دیکھتا ہوا بولا :۔

" میں کچھ سمجھا نہیں ، کیا بات ہے ؟ "

" شرماتے کا تو نہیں ، اُلٹا مجھی سے پوچھتا ہے تو روپا سے چُھپ چُھپ کر نہیں ہنستا بولتا ۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ گھر میں پیسے پیسے کی تنگی ہے اور اُس کیلئے پان لائے جاتے ہیں ۔ کپڑے رنگائے جاتے ہیں ! "

موہن نے عذر گناہ کیا جو گناہ سے بھی بد تر تھا ۔

" تو میں نے کونسا گناہ کر ڈالا ۔ اگر اس نے مجھ سے چار پیسے کے پان مانگے تو کیا کرتا ۔ کہتا کہ پیسے دے تو پان لاؤں گا ۔ اپنی ساڑھی رنگنے کو دیدی تو اُس سے رنگائی مانگتا "

محلے میں ایک تُو ہی بڑا دھنا سیٹھ ہے اُس نے اور کسی سے کیوں نہ کہا "

" یہ وہ جانے میں کیا بتاؤں "

" کبھی گھر میں بھی دھیلے کے پان لایا یا ساری خاطر داری دوسروں ہی کیلئے رکھ چھوڑی ہے "

" یہاں کس کے لئے پان لاتا "

" تیرے لئے کیا گھر کے سارے آدمی مر گئے ہیں "

" میں نہ جانتا تھا تم بھی پان کھانا چاہتی ہو "

" سنسار میں ایک رُوپا ہی پان کھانے کے لائق ہے ؟ "

"شوق سنگار کی بھی تو ایک عمر ہوتی ہے"

" بوٹی جل اُٹھی - اُسے بڑھیا کہہ دینا اُس کے تقوی و طہارت کو خاک میں ملا دینا تھا - بڑھاپے میں ان پابندیوں کی وقعت ہی کیا - جس نفس کُشی کے بَل پر وہ سب عورتوں کے سامنے سر اُٹھا کر چلتی تھی - اُس کی یہ ناقدری ! انھی لڑکوں کے پیچھے اس نے اپنی ساری جوانی خاک میں ملا دی - اُس کے شوہر کو گذرے آج پانچ سال ہوئے تب اُس کی چڑھتی جوانی تھی - یہ تین چینٹے پوت اس کے گلے منڈھ دئیے ہیں - ابھی اسکی عمر ہی کیا ہے - چاہتی تو آج وہ بھی ہونٹ سرخ کئے پاؤں میں مہاور لگائے ، اوٹ ، بچھوے پہنے مٹکتی پھرتی - یہ سب کچھ اس نے لڑکوں کے کارن تیاگ دیا - اور بوٹی بڑھیا ہے !

بولی " ہاں اور کیا میرے لئے تو اب پھٹے چیتھڑے پہننے کے دن ہیں جب تیرا باپ مرا تو میں رُوپا سے دو ہی چار سال بڑی تھی - اس وقت کوئی گھر کر لیتی تو تم لوگوں کا کہیں پتہ نہ لگتا - گلی گلی بھیک مانگتے پھرتے لیکن میں کہے دیتی ہوں اگر تو پھر اُس سے بولا تو یا تو تو ہی گھر میں رہے گا یا میں ہی رہوں گی "

موہن نے ڈرتے ڈرتے کہا " میں اُسے بات دے چکا ہوں - اماں "

" کیسی بات ؟ " " سگائی کی "

" اگر رُوپا میرے گھر میں آئی تو جھاڑو مار کر نکال دونگی - یہ سب اُس کی ماں کی مایا ہے - وہی کٹنی میرے لڑکے کو مجھ سے چھینے لیتی ہے - رانڈ سے اتنا بھی نہیں دیکھا جاتا - چاہتی ہے کہ اُسے سوت بنا کر میری چھاتی پر مونگ دُلے "

موہن نے دردناک لہجہ میں کہا " اماں ایشور کے لئے چُپ رہو - کیوں اپنا پانی آپ کھو رہی ہو - میں نے تو سمجھا تھا چار دن میں مینا اپنے گھر چلی جائے گی - تم اکیلی رہ جاؤ گی

اسی لئے اُسے لانے کا خیال ہوا۔ اگر تمھیں بُرا لگتا ہے تو جانے دو۔"

بُوٹی نے شبہ آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔" تو آج سے یہیں آنگن میں سویا کر"

" اور گائے بھینسیں باہر پڑی رہیں گی۔"

" پڑی رہنے دے کوئی ڈاکہ نہیں پڑا جاتا۔"

مجھ پر تجھے اِتنا شبہ ہے؟" " ہاں"

موہن نے خود داری کی شان سے کہا" میں یہاں نہ سوؤں گا۔"

" تو نکل جا میرے گھر سے۔

" ہاں تیری یہی مرضی ہے تو نکل جاؤں گا۔"

مینا نے کھانا پکایا موہن نے کہا" مجھے بھوک نہیں ہے۔"

بُوٹی اُسے منانے نہ گئی۔ موہن کا سرکش دل ماں کے اس جابرانہ حکم کو کسی طرح قبول نہیں کرسکتا۔ ماں کا گھر ہے لے لے اپنے۔ لئے وہ کوئی دوسرا ڈھونڈھ لے گا۔ رُوپا نے اس کی بے لطف، بے کیف زندگی میں ایک مسرت پیدا کر دی تھی۔ جب وہ اپنے دل میں ایک ناقابل بیان شورش کا احساس کر رہا تھا۔ جب وہ اپنی زندگی کی معمولی پُر مشقت رفتار سے بیزار ہو رہا تھا۔ جب دُنیا اُسے سونی سونی دلچسپیوں سے خالی نظر آرہی تھی۔ اُس وقت رُوپا نے اس کی زندگی میں بہار کی طرح رونما ہو کر اُسے سُرخ کونپلوں اور طیور کے نغموں سے حلاوت پیدا کر دی۔ اب اس کی یہ کیفیت تھی کہ کوئی کام کرتا ہوتا تو دل رُوپا کی طرف لگا ہوتا۔ یہی ارمان تھا کہ اُسے کیا چیز دیدے کہ وہ خوش ہو جائے بڑی ہمت کر کے اُس نے۔ اس سے اپنا دردِ دل کہا۔ اب آج وہ کس منہ سے اُس کے پاس جائے۔ کیا اُس سے کہے کہ اماں نے مجھے تم سے ملنے

کی ممانعت کی ہے۔ ابھی کل تو چراگاہ میں برگد کے سایہ دار درخت کے نیچے دونوں میں کیسے اخلاص کی باتیں ہو رہی تھیں۔ موہن نے کہا تھا "رُوپا تم اتنی سُندر ہو کہ تمہارے سوگاہک نکل آئیں گے۔ تم جس گھر میں جاؤ گی۔ وہ روشن ہو جائے گا۔ میرے گھر میں تمہارے لئے کیا رکھا ہے" اس پر رُوپا نے جواب دیا تھا وہ ایک نغمۂ لطیف کی طرح اس کے جسم کی ایک ایک رگ میں، اس کی رُوح کے ایک ایک ذرّہ میں بسا ہوا تھا" اُس نے کہا تھا "میں تو تم کو چاہتی ہوں موہن، صرف تم کو پرگنے کے چودھری ہو جاؤ تب بھی موہن ہو۔ مزدوری کرنے لگو تب بھی موہن ہو" وہ اپنے موہن کے لئے افلاس اور رُسوائی اور فاقہ کشی سب کچھ جھیل لے گی" اُسی رُوپا سے اب وہ جا کر کہے "مجھے اب تم سے کوئی سروکار نہیں ہے"

نہیں یہ غیر ممکن ہے اُسے گھر کی پرواہ نہیں ہے۔ وہ رُوپا کے ساتھ ماں سے الگ رہے گا۔ یہاں نہ سہی کسی دوسرے محلّے میں سہی۔ اس وقت بھی رُوپا اُس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ کیسے اچھے بیڑے لگاتی ہے کہ جی خوش ہو جاتا ہے جیسے بیڑوں میں پریم گھول دیتی ہے۔ لیکن جاؤ گے کیسے؟ اماں سے وعدہ نہیں کیا ہے۔ کہیں اماں سُن لیں کہ یہ رات کو رُوپا کے پاس گیا تھا تو جان ہی دیدیں۔ تو میرا کیا نقصان دیدیں جان اپنی تقدیر کو تو نہیں بکھانتیں کہ ایسی دیوی جو انھیں پان کی طرح پھیرے گی۔ اُلٹے اور اُس سے جلتی ہیں۔ نہ جانے کیوں رُوپا سے اسے اتنی چڑ ہے؟ وہ ذرا پان کھا لیتی ہے۔ ذرا رنگین ساڑھی پہن لیتی ہے۔ بس یہی تو اس کی عمر کھانے پہننے کی ہے کیا بُرا کرتی ہے۔

چوڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ رُوپا آ رہی ہے شاید۔ ہاں وہی ہے۔ موہن

کے سازِ جسم کے سارے تار جھنکار اُٹھے۔ اُس کے وجود کا ایک ایک ذرّہ ناچنے لگا۔ رُوپا اُس کے دروازے پر آئی! شیریں ادا رُوپا، کیسے اس کا خیر مقدم کرے، کیا کرے؟ جا کر اس کے قدموں پر سر رکھ دے۔

رُوپا اس کے سرہانے آکر بولی۔ "کیا سو گئے موہن؟ اتنی جلدی، گھڑی بھر سے تمھاری راہ دیکھ رہی ہوں آئے کیوں نہیں؟"

موہن نیند کا بہانہ کئے پڑا رہا۔

رُوپا نے اس کا سر ہلا کر کہا۔ "کیا سو گئے موہن ابھی سے، اپنا پان کھا لو۔"

اس کی انگلیوں میں کیا اعجاز تھا، کون جانے؟ موہن کی رُوح میں جیسے شادیانے بجنے لگے۔ اس کی جان رُوپا کے قدموں پر سر رکھنے کے لئے گویا اُچھل پڑی دیوی برکتوں کا تھال لئے اُس کے سامنے کھڑی ہے۔ ساری کائنات مسرّت سے رقص کر رہی ہے اُسے معلوم ہوا جیسے اُس کا جسم لطیف ہو گیا ہے اور وہ کسی صدائے مضطرب کی طرح فضا کی گود سے چمٹا ہوا اس کے ساتھ رقص کر رہا ہے! رُوپا نے پھر کہا۔ "میں جاتی ہوں نہیں جاگتے نہ جاگو۔ ہاں نہیں تو۔"

موہن اب ضبط نہ کر سکا۔ "ہاں ذرا نیند آ گئی تھی۔ تم اس وقت کیا کرنے آئیں۔ کہیں امّاں دیکھ لیں تو مجھے مار ہی ڈالیں۔"

رُوپا نے اس کے منہ میں پان کا بیڑا رکھ کر کہا۔ "تم آج آئے کیوں نہیں؟"

"آج امّاں سے لڑائی ہو گئی۔"

"کیا کہتی تھیں؟"

"کہتی تھیں رُوپا سے بولو گے تو میں جان دے دوں گی۔"

"تم نے پوچھا نہیں رُوپا سے کیوں اتنا چڑھتی ہو؟"

"اب ان کی بات کیا کہوں رُوپا۔ وہ کسی کا کھانا پینا نہیں دیکھ سکتیں۔"

"یہ بات نہیں ہے موہن انھیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔ میں چنچل تھی نہ۔ لیکن اب تو میں کسی سے نہیں ہنستی۔"

"اماں کو کیسے سمجھاؤں؟"

"تم میرے پاس ایک بار روز آجایا کرو۔ بس اور میں کچھ نہیں چاہتی۔"

دفعتہً موہن کے گھر کا دروازہ کھلا۔ شاید بُڑھی آرہی ہے رُوپا سرک گئی موہن بھیگی بلّی بن گیا۔

(۲)

موہن دوسرے دن سو کر اُٹھا تو اس کے دل میں مسرت کا دریا موجزن تھا۔ اُس کی خلقی خشونت اور تندی غائب ہو گئی تھی۔ گویا بچے کو مٹھائی مل گئی ہو۔ وہ سوہن کو ہمیشہ ڈانٹتا تھا۔ سوہن آرام طلب اور کاہل تھا۔ گھر کے کام دھندے سے جی چراتا تھا آج بھی وہ آنگن میں بیٹھا اپنی دھوتی میں صابن لگا رہا تھا۔ غازی میاں کے میلے کی تیاری کر رہا تھا۔ موہن کو دیکھتے ہی اس نے صابن چھپا دیا۔ اور بھاگ جانے کے لئے بل ڈھونڈھنے لگا۔

موہن نے مخلصانہ تبسم کے ساتھ کہا "کیا دھوتی بہت میلی ہو گئی ہے۔ سوہن دھوبی کو کیوں نہیں دیدیتے۔"

"دھوبن پیسے نہ مانگے گی؟"

"تو پیسے اماں سے کیوں نہیں مانگ لیتے۔"

"اماں پیسے دے چکیں اُلٹی گھڑکیاں دیں گی" !

"تو مجھ سے لے لو"

یہ کہکر اُس نے ایک اکنی اس کی طرف پھینک دی۔ سوہن باغ باغ ہو گیا۔ بھائی اور ماں دونوں اس کو ملامت کرتے رہتے تھے۔ بہت دنوں کے بعد آج اُسے محبت کی شیرینی کا مزہ ملا۔ اُکنی اُٹھالی اور دھوتی وہیں چھوڑ گائے کو کھولنے چلا۔

موہن نے کہا۔ "تم رہنے دو۔ میں اسے لئے جاتا ہوں"

سوہن نے گائے کو کھونٹے سے کھول کر باہر ناند پہ باندھ دیا اور اندر آکر بھائی سے بولا "تمھارے لئے چلم رکھ لاؤں"

آج پہلی بار سوہن نے بڑے بھائی کی جانب ایسے حُسن عقیدت کا اظہار کیا۔ اس میں کیا راز ہے۔ یہ موہن کی سمجھ میں نہ آیا۔ برادرانہ خلوص سے اس کا چہرہ شگفتہ ہو گیا بولا "آگ ہو تو رکھ لاؤ"

مینا سر کے بال کھولے آنگن میں گھروندا بنا رہی تھی۔ موہن کو دیکھتے ہی اُس نے گھروندا بگاڑ دیا۔ اور آنچل سے سر ڈھانکنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی رسوئی گھر کی طرف برتن اُٹھانے چلی۔ موہن کے غصہ سے سب ہی ڈرتے تھے۔

موہن نے پیار سے پُوچھا۔ "کیا کھیل رہی تھی مینا ؟"

مینا تھرتھر کانپتی ہوئی بولی "کچھ نہیں"

"تُو تو بہت اچھے گھروندے بنالیتی ہے ذرا بنا تو دیکھوں"

موہن کے مزاج میں آج یہ پُرلطف انقلاب دیکھ کر مینا کو یکایک یقین نہ آیا۔ لیکن پھر بھی اس کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ پیار کے ایک لفظ میں کتنا جادو ہے مُنہ سے نکلتے ہی

جیسے ایک دلکشی سی پھیل گئی۔ جس نے سنا اس کا دل کھل اٹھا جہاں خوف اور بدگمانی تھی وہاں اعتبار اور خلوص چمک اٹھا۔ جہاں بیگانگی تھی وہاں اپنا پا سا چھلک پڑا۔ چاروں طرف انہماک چھا گیا۔ کہیں سستی نہیں۔ کہیں بے دلی نہیں، کہیں بے نیازی نہیں۔ لوگوں کی ترقیاں ہوتی ہیں۔ خطاب ملتے ہیں۔ مقدمات میں فتح ہوتی ہے۔ لیکن ان چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے واقعات میں جو شیرینی ہے وہ ان اوکھ اور گنّے کے کھیتوں میں کہاں! موہن کے سینے میں آج محبّت کا سوتا سا کھل گیا تھا۔ اس میں مسرت ہمدردی اور خلوص کی دھاریں سی نکل رہی تھیں۔

مینا گھروندا بنانے بیٹھ گئی۔

موہن نے اس کے الجھے ہوئے بالوں کو سلجھا کر کہا۔ "تیری گڑیا کا بیاہ کب ہوگا مینا۔ جلد نیوتہ دے۔ کچھ مٹھائی کھانے کو ملے۔"

مینا آسمان میں اڑ رہی تھی۔ بھیّا کتنے اچھے ہیں۔ اب بھیّا پانی مانگیں گے تو وہ لوٹے کو راکھ سے خوب چما چم کر کے پانی لے جائیگی۔

" امّاں پیسے نہیں دیتیں گڈا تو ٹھیک ہو گیا ہے۔ لیکن ٹیکا کیسے بھیجوں "

" کتنے پیسے لگیں گے ؟"

" ایک پیسے کے بتاشے لوں گی، اور ایک پیسہ کا گلابی رنگ جوڑے تو رنگے جائیں گے کہ نہیں "

"تو دو پیسے میں تیری گڑیا کا بیاہ ہو جائے گا۔ کیوں ؟"

"ہاں تم دو پیسے دیدو تو میری گڑیا کا دھوم دھام سے بیاہ ہو جائے "

موہن نے دو پیسے ہاتھ میں لے کر مینا کو دکھائے۔ مینا لپکی۔ موہن نے ہاتھ اوپر

اٹھایا۔ مینا نے ہاتھ پکڑ کے نیچے کھینچنا شروع کیا۔ جب یوں نہ پا سکی تو موہن کی گود میں چڑھ گئی اور پیسے لے لئے۔ پھر نیچے آ کر ناچنے لگی تب اپنی سہیلیوں کو شادی کا نوید سُنانے دوڑی۔

اسی وقت بُوٹی گوبر کا جھوا لئے سار کے گھر سے نکلی۔ موہن کو کھڑے دیکھ کر تند لہجہ میں بولی " ابھی تک مٹرگشت ہی ہو رہی ہے بھینسیں کب دوہی جائیں گی ؟ "

آج موہن نے بُوٹی کو سخت جواب نہ دیا۔ ماں کو بوجھ سے دبے ہوئے دیکھ کر اس نے اضطراری طور پر اس کے سر سے جھوا لے کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

بُوٹی نے کہا۔ " رہنے دے جا کر بھینس دودھ لے۔ گوبر تو میں لئے جاتی ہوں "

" تم اتنا بھاری بوجھ کیوں اُٹھا لیتی ہو اماں، مجھے کیوں نہیں بُلا لیتیں "

ماں کا دل ممتا سے رقیق ہو گیا۔

" تو جا اپنا کام دیکھ، میرے پیچھے کیوں پڑتا ہے ؟

" گوبر نکالنے کا کام میرا ہے "

" دودھ کون دوہیگا "

" وہ بھی میں کر لوں گا "

" تو اتنا کہاں کا جودھا ہے کہ سارے کام کر لے گا "

" جتنا کہتا ہوں اُتنا کر لوں گا "

" تو میں کیا کروں گی "

تم لڑکوں سے کام لو جو بے راہ چلے اُسے سمجھاؤ۔ جو غلطی دیکھو اُسے ٹھیک کر دو۔ بس یہی تمھارا کام ہے "

"میری سنتا ہے کوئی ؟"

آج موہن بازار دودھ پہونچا کر لوٹا تو ایک چھوٹا سا پاندان، پان، کتھا چھالیا اور تھوڑی سی مٹھائی لایا۔ بوڑھی بگڑ کر بولی "آج روپے کہیں فالتو ل گئے تھے کیا ؟ اس طرح تو پیسے اڑائے گا تو کے دن نباہ ہوگا ؟"

میں نے تو ایک پیسہ بھی فضول خرچ نہیں کیا۔ اماں میں سمجھتا تھا تم پان کھاتی ہی نہیں اسی لئے نہ لاتا تھا۔"

" تو اب میں پان کھانے بیٹھوں گی ؟ "

"کیوں اس میں ہرج کیا ہے۔ جس کے دو دو جوان بیٹے ہوں کیا وہ اتنا شوق بھی نہ کرے ؟"

بوڑھی کے سخت خزاں رسیدہ دل میں کہیں سے ہریالی نکل آئی ایک ننھی سی کونپل تھی۔ لیکن اس کے اندر کتنی طراوت، کتنی رطوبت، کتنی جان بخشی بھری ہوئی تھی۔ جیسے اس کے چہرے کی جھریاں چکنی ہو گئیں۔ آنکھوں میں نور آگیا۔ دل مایوس میں ایک ترنم سا ہونے لگا۔ اس نے ایک مٹھائی سوہن کو دی۔ ایک مینا کو اور ایک موہن کو دینے لگی۔

موہن نے کہا۔ "مٹھائی تو میں لڑکوں کے لئے لایا تھا اماں"

" اور تو بوڑھا ہو گیا کیوں ؟"

" ان لڑکوں کے سامنے تو بوڑھا ہی ہوں"

" لیکن میرے سامنے تو لڑکا ہی ہے"

موہن نے مٹھائی لے لی۔ مینا نے مٹھائی کے پاتے ہی گپ سے منہ میں

ڈال لی تھی، اور وہ زبان پر مٹھاس کی لذت چھوڑ کر کب کی قعر فنا میں جا چکی تھی۔ موہن کی مٹھائی کو للچائی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ موہن نے وہ مٹھائی مینا کو دیدی۔ ایک مٹھائی اور بچ رہی تھی، بوٹی نے اسے موہن کی طرف بڑھا کر کہا:۔

" لا بھی تو ذرا سی مٹھائی "

موہن نے کہا " وہ تم کھا جانا اماں "

"تمھیں کھاتے دیکھ کر مجھے جو خوشی ہوگی اس میں مٹھاس سے زیادہ مزہ ہے"

موہن نے مٹھائی کھالی اور باہر چلا گیا۔ بوٹی پاندان کھول کر دیکھنے لگی۔ آج زندگی میں پہلی بار اسے یہ خوش نصیبی حاصل ہوئی۔ زہے نصیب کہ شوہر کے راج میں جو نعمت نہ میسر ہوئی وہ بیٹے کے راج میں ملی۔ پاندان میں کئی کلیاں ہیں۔ ان میں چونہ رہے گا۔ اس میں کتھا۔ اس میں چھالیہ۔ اس میں تمباکو۔ واہ! یہاں تو دو چھوٹی چھوٹی چمچیاں بھی ہیں۔ مزے سے چونہ کتھا لگا لو۔ انگلی میں داغ تک نہ لگے۔ ڈھکنے میں کڑا لگا ہوا ہے۔ جہاں جاؤ لٹکا کر لئے چلے جاؤ۔ اوپر کی طشتری میں پان رکھے جائیں گے۔ مگر سروتے کے لئے کہیں جگہ نہیں ہے نہ سہی۔ اس نے پاندان کو مانجھ دھو کر اس میں چونہ کتھا رکھا۔ چھالیہ کاٹ کر رکھی۔ پان بھگو کر طشتری میں رکھے تب ایک بیڑا لگا کر کھایا۔ اس بیڑے کے عرق نے جیسے اس کی بیوگی کی کرختگی کو ملائم کر دیا۔ دل کی مسرت عنایت و کرم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اب بوٹی کیسے بیٹھی رہے۔ اس کا دل اتنا گہرا نہیں ہے کہ یہ خوبئ قسمت اس میں جا کر گم ہو جائے گھر میں ایک پرانا آئینہ پڑا ہوا تھا۔ بوٹی نے اس میں اپنا منہ دیکھا۔ ہونٹوں پر سرخی نہیں ہے۔ منہ لال کرنے کے لئے اس نے تھوڑا ہی پان کھایا ہے۔ سرخی ہوتی تو وہ

کلی کرلیتی۔ گاؤں کی ایک عورت دھنیا نے آکر کہا "کاکی جرا رسّی دیدو رسّی ٹوٹ گئی ہے"

کل بوٹی نے صاف کہدیا تھا۔ "میری رسّی گاؤں بھر کے لئے نہیں ہے۔ رسّی ٹوٹ گئی ہے تو بنوا کیوں نہیں لیتی" لیکن آج اُس نے اتنی کج خلقی سے کام نہ لیا۔ اُس نے خندہ پیشانی سے رسّی نکال کر دھنیا کو دیدی اور ہمدردانہ انداز سے پوچھا۔ "لڑکے کے دست بند ہوئے یا نہیں دھنیا؟"

دھنیا نے کہا۔ "نہیں کاکی۔ آج تو دن بھر دست آئے جانوں دانت آرہے ہیں"

"پانی بھر نے تو چل ذرا دیکھوں دانت ہی ہے کہ کوئی اور فساد ہے کسی کی نجر وجر تو نہیں لگی؟"

"کیا جانوں کاکی کون جانے کسی کی آنکھیں پھوٹی ہوں؟"

"چونچال لڑکوں کو نجر کا بڑا ڈر رہتا ہے جس نے چمکار کر بلایا اُسی کی گود میں چلا جاتا ہے۔ کاکی ایسا سہدون کی طرح ہنستا ہے کہ تم سے کیا کہوں"

"کبھی کبھی اُس کی نجر بھی لگ جاتی ہے بچے کو"

"اے نوج کاکی بھلا کوئی اپنے بچے کو نجر لگائے گا"

"یہی تو تو سمجھتی نہیں نجر کوئی لگاتا نہیں آپ ہی آپ لگ جاتی ہے"

دھنیا پانی لے کر آئی تو بولی اس کے ساتھ بچے کو دیکھنے چلے۔

"تو اکیلی ہے آج کل تو گھر کے کام دھندے میں بڑا جھنجھٹ ہوتا ہوگا"

"نہیں کاکی رُدیا آجاتی ہے۔ اُس سے بڑی مدد ملتی ہے نہیں اکیلی میں کیا کرتی"

" بوٹی کو تعجب ہوا۔ روپا کو اس نے محض تتلی سمجھ رکھا تھا۔ جس کا کام پھولوں پر بیٹھنا اور پھر اُڑ جانا تھا۔ حیرت انگیز لہجہ میں بولی " روپا!"

" ہاں کاکی بیچاری بڑی بھلی ہے۔ جھاڑو لگا دیتی ہے چوکا برتن کر دیتی ہے لڑکے کو سنبھالتی ہے۔ گاڑھے سے کون کسی کی بات پوچھتا ہے کاکی "

" اسے تو اپنے مستی کا جل سے ہی چھٹی نہ ملتی ہوگی؟"

" یہ تو اپنی اپنی رچ ہے کاکی مجھے تو مستی کا جل والی نے عین سہارا دیا، اتنا کسی پوجا پاٹھ کرنے والی نے نہ دیا۔ کل بیچاری رات بھر جاگتی رہی۔ میں نے اُسے کچھ دے تو نہیں دیا۔ ہاں جب تک جیوں گی اُس کا جس گاؤں گی "

" تو اُس کے گن ابھی نہیں جانتی دھنیا۔ پان کے لئے پیسے کہاں سے آتے ہیں۔ رنگین ساڑیاں کون لاتا ہے کچھ سمجھتی ہے؟"

میں ان باتوں میں نہیں پڑتی کاکی۔ پھر سوک سنگار کرنے کو کس کا جی نہیں چاہتا کھانے پہننے کی یہی تو عمر ہے۔

دھنیا کا گھر آگیا۔ آنگن میں روپا بچے کو گود میں لئے تھپکیاں دے رہی تھی بچہ سو گیا تھا۔ دھنیا نے بچہ کو اس سے لے کر کھٹولے پر سلا دیا۔ بوٹی نے بچے کے سر پر ہاتھ رکھا۔ پیٹ میں آہستہ آہستہ انگلی گڑا کر دیکھا۔ ناف پر ہینگ کا لیپ کرنے کی تاکید کی۔ روپا پنکھا لاکر اُسے جھلنے لگی۔

بوٹی نے کہا " لا پنکھا۔ بیٹی مجھے دیدے " میں جھلوں گی تو کیا چھوٹی ہو جاؤں گی "

" تو دن بھر یہاں کا کام دھندا کرتی رہتی ہے تھک گئی ہوگی "

" تم اتنی بھلی مانس ہو۔ اور یہاں لوگ کہتے ہیں۔ بغیر گالی کے کسی سے بات

نہیں کرتیں ۔ اس سے تمھارے پاس آنے کو ہمت نہ پڑتی تھی"

بُدّھی مسکرائی ۔ "وہ لوگ جھوٹ تو نہیں کہتے"

" اپنی آنکھوں کی دیکھی مانوں یا کانوں کی سُنی" آج بھی روپا آنکھوں میں کاجل لگائے، پان کھائے ۔ رنگین ساڑھی پہنے ہوئے تھی ۔ مگر آج بُدّھی کو معلوم ہوا کہ پھول میں محض رنگ نہیں ہے بُو بھی ہے ۔ اُسے رُوپا سے جو ایک طرح کا بغض للّہی تھا ۔ وہ آئینہ پر جمے ہوئے گرد کی طرح صاف ہو گیا تھا ۔ کتنی نیک سیرت ۔ کتنی سگھڑ اور شرمیلی لڑکی ہے ۔ آواز کتنی پیاری ہے ۔ آج کل کی لڑکیاں اپنے بچوں کی تو پرواہ نہیں کرتیں ۔ دوسروں کے لئے کون مرتا ہے ساری رات دھنیا کے بچے کو لئے جاگتی رہی ۔ موہن نے کل کی باتیں اس سے کہہ تو دی ہوں گی ۔ دوسری لڑکی ہوتی تو مجھے دیکھ کر مُنہ پھیر لیتی ۔ اسے تو جیسے کچھ معلوم ہی نہیں ۔ ممکن ہے ۔ موہن نے اس سے کچھ کہا ہی نہ ہو ضرور یہی بات ہے ۔

آج رُوپا اُسے بہت حسین معلوم ہوئی ٹھیک تو ہے ابھی شوق سنگار نہ کرے گی تو کب کرے گی ۔ شوق سنگار اس لئے بُرا لگتا ہے کہ ایسے آدمی اپنے ہی عیش و آرام میں مست رہتے ہیں ۔ کسی کے گھر میں آگ لگ جائے اُن سے مطلب نہیں، ان کا کام تو صرف دوسروں کا رجھانا ہے ۔ جیسے اپنے روپ کو سجائے راہ چلتوں کو بلاتے ہوں کہ ذرا اس دوکان کی سیر بھی کرتے جائیے ۔ ایسے نیک دل آدمیوں کا سنگار بُرا نہیں لگتا ۔ بلکہ اور اچھا لگتا ہے ۔ کون نہیں چاہتا کہ لوگ اس کے رنگ روپ کی تعریف کریں ۔ کون دوسروں کی نظر میں کھب جانا نہیں چاہتا ۔ بُدّھی کا شباب کب کا رخصت ہو چکا تھا ۔ پھر بھی یہ تمنّا اُس کے دل میں موجود تھی ۔ زمین پر پاؤں نہیں پڑتے پھر ر ہا تو ابھی جوان ہے ۔

رُوپا اب قریب قریب دو ایک بار روز بوٹی کے گھر آتی۔ بوٹی نے موہن سے تقاضا کرکے اس کے لئے اچھی سی ساڑی منگوادی۔ اگر رُوپا بغیر کاجل لگائے یا محض سفید ساڑی پہنے آجاتی تو بوٹی کہتی ۔" بہو بیٹیوں کو یہ جوگیا بھیس اچھا نہیں لگتا۔ یہ بھیس تو ہم بوڑھیوں کے لئے ہے "

روپا کہتی " تم بوڑھی کس طرح ہوگئیں اماں ! مَردوں کو اشارہ مل جائے تو بھونروں کی طرح منڈلانے لگیں۔ میرے دادا تو تمھارے دروازے پر دھرنا دینے لگیں"

بوٹی لطف آمیز ملامت کے ساتھ کہتی " چل میں تیری ماں کی سَوت بن کر جاؤں گی "

" اماں تو بوڑھی ہوگئیں "

" تو کیا تیرے دادا جوان بیٹھے ہیں "

" ہاں اماں ! بڑی اچھی کاٹھی ہے اُن کی "

آج موہن بازار سے دودھ بیچ کر لوٹا تو بوٹی نے کہا " کچھ روپیہ پیسے کی فکر کر بھائی۔ میں روپا کی ماں سے تیری بات چیت پکی کر رہی ہوں "

عصمت ۱۹۳۳ء

عید گاہ

رمضان کے پورے تیس روزوں کے بعد آج عید آئی ہے۔ کتنی سہانی اور رنگین صبح ہے۔ بچّہ کی طرح پُر تبسّم۔ درختوں پر کچھ عجیب ہریاول ہے کھیتوں میں کچھ عجیب رونق ہے۔ آسمان پر کچھ عجیب فضا ہے۔ آج کا آفتاب دیکھو کتنا پیارا ہے گویا دنیا کو عید کی خوشی پر مبارک باد دے رہا ہے۔ گاؤں میں کتنی چہل پہل ہے عید گاہ جانے کی دھوم ہے۔ کسی کے کرتے میں بٹن نہیں ہیں۔ سوئی تاگا لینے دوڑا جا رہا ہے۔ کسی کے جوتے سخت ہو گئے ہیں۔ اسے تیل اور پانی سے نرم کر رہا ہے۔ جلدی جلدی بیلوں کو سانی پانی دیدیں۔ عید گاہ سے لوٹتے لوٹتے دوپہر ہو جائیگی۔ تین کوس کا پیدل راستہ پھر سینکڑوں رشتے قرابت والوں سے ملنا ملانا۔ دوپہر سے پہلے لوٹنا غیر ممکن ہے۔ لڑکے سب سے زیادہ خوش ہیں۔ کسی نے ایک روزہ رکھا وہ بھی دوپہر تک، کسی نے وہ بھی نہیں لیکن عید گاہ جانے کی خوشی اُن کا حصّہ ہے روزے بڑے بوڑھوں کے لئے ہوں گے۔ بچّوں کے لئے تو عید ہے۔ روز عید کا نام رٹتے تھے۔ آج وہ آ گئی۔ اب جلدی پڑی ہوئی ہے کہ عید گاہ کیوں نہیں چلتے۔ انھیں گھر کی فکروں سے کیا واسطہ سیوئیوں کے لئے گھر میں دودھ اور شکر میوے ہیں یا نہیں اس کی انھیں کیا فکر۔ وہ کیا جانیں۔ ابا جان کیوں بدحواس گاؤں کے مہاجن

چودھری قاسم علی کے گھر دوڑے جا رہے ہیں۔ اُن کی اپنی جیبوں میں تو قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ بار بار جیب سے اپنا خزانہ نکال کر گنتے ہیں۔ دوستوں کو دکھاتے ہیں اور خوش ہو کر رکھ لیتے ہیں۔ انہیں دو چار پیسوں میں دنیا کی ساری نعمتیں لائیں گے۔ کھلونے اور مٹھائیاں اور بگل اور خدا جانے کیا کیا۔ اور سب سے زیادہ خوش ہے حامد وہ چار سال کا غریب صورت بچہ ہے۔ جس کا باپ پچھلے سال ہیضہ کی نذر ہو گیا۔ اور ماں نہ جانے کیوں زرد ہوتی ہوتی ایک دن مر گئی۔ کسی کو پتہ نہ چلا کیا بیماری ہے کہتی کس سے کون سننے والا تھا۔ دل پہ جو گذرتی تھی سہتی تھی۔ اور جب نہ سہا گیا دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اب حامد اپنی بوڑھی دادی امینہ کی گود میں سوتا ہے، اور اتنا ہی خوش ہے۔ اس کے ابا جان بڑی دور روپے کمانے گئے ہیں۔ بہت سی تھیلیاں لے کر آئیں گے۔ امی جان اللہ میاں کے گھر مٹھائی لینے گئی ہیں۔ اس لئے خاموش ہے۔ حامد کے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں۔ سر پہ ایک پرانی دھرانی ٹوپی ہے جس کا گوٹا سیاہ ہو گیا ہے۔ پھر بھی وہ خوش ہے۔ جب اس کے ابا جان تھیلیاں اور اماں جان نعمتیں لے کر آئیں گی۔ تب وہ دل کے ارمان نکالے گا۔ تب دیکھیں گا محمود اور محسن نور اور سمیع کہاں سے اتنے پیسے لاتے ہیں۔ دنیا اپنی مصیبتوں کی ساری فوج لیکر آئے اس کی ایک نگاہ معصوم اسے پامال کرنے کے لئے کافی ہے۔"

حامد اندر جا کر امینہ سے کہتا ہے تم ڈرنا نہیں، اماں میں گاؤں والوں کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔ بالکل نہ ڈرنا۔ لیکن امینہ کا دل نہیں مانتا۔ گاؤں کے بچے اپنے اپنے باپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔ حامد کیا اکیلا ہی جائے گا۔ اس بھیڑ بھاڑ میں کہیں کھو جائے تو کیا ہو۔ نہیں امینہ اسے تنہا نہ جانے دیگی۔ ننھی سی جان تین کوس چلے گا۔ پاؤں

ہیں چھالے نہ پڑ جائیں گے۔

مگر وہ چلی جائے تو یہاں سوئیاں کون پکائے گا۔ بھوکا پیاسا دوپہر کو لوٹے گا۔ کیا اس وقت سوئیاں پکانے بیٹھے گی۔ رونا تو یہ ہے کہ امینہ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس نے فہمین کے کپڑے سئے تھے آٹھ آنے پیسے ملے تھے۔ اس اٹھنی کو ایمان کی طرح بچاتی چلی آتی تھی۔ اس عید کے لئے لیکن کل گھر میں کچھ نہ تھا۔ اور گوالن کے پیسے چڑھ گئے تھے۔ دینے پڑے۔ حامد کے لئے دو پیسے کا روز دودھ تو لینا پڑتا ہے۔ اب کل دو آنے پیسے بچ رہے ہیں۔ تین پیسے حامد کی جیب میں اور پانچ امینہ کے بٹوے میں یہی بساط ہے۔ اللہ ہی بیڑا پار کرے۔ دھوبن، مہترانی اور نائن سب ہی تو آئیں گی۔ سب کو سوئیاں چاہئیں۔ کس کس سے منہ کیوں چھپائے؟ سال بھر کا تہوار ہے زندگی خیریت سے رہے ان کی تقدیر بھی تو اس کے ساتھ ہے۔ بچے کو خدا سلامت رکھے۔ یہ دن بھی یوں ہی کٹ جائیں گے۔

گاؤں سے لوگ چلے اور بچوں کے ساتھ حامد بھی تھا۔ سب کے سب دوڑ کر آگے نکل جاتے۔ پھر کسی درخت کے نیچے کھڑے ہو کر ساتھ والوں کا انتظار کرتے یہ لوگ کیوں اتنے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔

شہر کا سواد شروع ہو گیا۔ سڑک کے دونوں طرف امیروں کے باغ ہیں پختہ چہار دیواری بنی ہوئی ہے۔ درختوں میں آم لگے ہوئے ہیں۔ حامد نے ایک کنکری اٹھا کر ایک آم پر نشانہ لگایا۔ مالی اندر سے گالی دیتا ہوا باہر آیا۔ بچے وہاں سے ایک فرلانگ پر ہیں۔ خوب ہنس رہے ہیں۔ مالی کو کیسا الو بنایا۔

بڑی بڑی عمارتیں آنے لگیں۔ یہ عدالت ہے یہ مدرسہ ہے، یہ کلب گھر ہے۔

اتنے بڑے مدرسہ میں کتنے سارے لڑکے پڑھتے ہوں گے ۔ لڑکے نہیں ہیں جی ۔ بڑے بڑے آدمی ہیں ۔ سچ اُنکی بڑی بڑی مونچھیں ہیں ۔ اتنے بڑے ہو گئے ۔ ابھی تک پڑھنے جاتے ہیں ۔ آج تو چھٹی ہے ۔ لیکن ایک بار جب پہلے آئے تھے تو بہت سے ڈاڑھی مونچھوں والے لڑکے یہاں کھیل رہے تھے ۔ نہ جانے کب تک پڑھیں گے اور کیا کریں گے ۔ اتنا پڑھ کر گاؤں کے دیہاتی مدرسے میں دو تین بڑے بڑے لڑکے ہیں ۔ بالکل کودن ۔ غبی کام سے جی چرانے والے ۔ یہ لڑکے بھی اسی طرح کے ہوں گے جی ۔ اور کیا نہیں ۔ کیا اب تک پڑھتے ہوتے ۔ وہ کلب گھر ہے وہاں جادو کا کھیل ہوتا ہے ۔ سُنا ہے مُردوں کی کھوپڑیاں اُڑتی ہیں ۔ آدمی کو بیہوش کر دیتے ہیں ۔ پھر اس سے جو کچھ پوچھتے ہیں وہ سب بتلا دیتا ہے اور بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں اور میمیں بھی کھیلتی ہیں ۔ سچ ۔ ہماری اماں کو وہ دیدو کیا کہلاتا ہے " بیٹ " تو اُسے گھماتے ہی لڑھک جائیں ۔

محسن نے کہا " ہماری امّی جان تو اُسے پکڑ ہی نہ سکیں ہاتھ کانپنے لگے اللہ قسم ! "

حامد نے اس سے اختلاف کیا " چلو منوں آٹا پیس ڈالتی ہیں ذرا سی بیٹ پکڑ لیں گی تو ہاتھ کانپنے لگے گا ۔ سینکڑوں گھڑے پانی روز نکالتی ہیں ۔ کسی میم کو ایک گھڑا پانی نکالنا پڑے تو آنکھوں تلے اندھیرا آ جائے ۔

محسن ۔ " لیکن دوڑتی تو نہیں ۔ اچھل کود نہیں سکتیں ۔

حامد ۔ " کام آپڑتا ہے تو دوڑ بھی لیتی ہیں ۔ ابھی اُس دن تمہاری گائے کھُل گئی تھی ۔ اور چودھری کے کھیت میں جا پڑی تھی تو تمہاری اماں ہی تو دوڑ کر اُسے

بھگالائی تھیں۔ کتنی تیزی سے دوڑی تھیں ہم تم دونوں اُن سے پیچھے رہ گئے"۔
پھر آگے چلے حلوائیوں کی دوکانیں شروع ہوئیں۔ آج خوب سجی ہوئی تھیں۔ اتنی مٹھائیاں کون کھاتا ہے؟ دیکھو نا ایک ایک دوکان پر منتوں ہوں گی۔ سُنا ہے رات کو ایک جنّات ہر ایک دوکان پر جاتا ہے اور جتنا مال بچا ہوتا ہے وہ سب خود خرید لیتا ہے اور سچ مچ کے روپے دیتا ہے بالکل ایسے ہی چاندی کے روپے۔

محمود کو یقین نہ آیا۔ "ایسے روپے جنّات کو کہاں سے مل جائیں گے"؟
محسن۔" جنات کو روپوں کی کیا کمی جس خزانہ میں چاہیں چلے جائیں۔ کوئی انھیں دیکھ نہیں سکتا۔ لوہے کے دروازے تک نہیں روک سکتے جناب آپ ہیں کس خیال میں۔ ہیرے جواہرات ان کے پاس رہتے ہیں جس سے خوش ہو گئے اُسے ٹوکروں جواہرات دیدئے۔ پانچ منٹ میں کھو کابل پہنچ جائیں"۔

حامد۔" جناب بہت بڑے ہوتے ہوں گے"۔
محسن۔" اور کیا۔ ایک ایک آسمان کے برابر ہوتا ہے۔ زمین پر کھڑا ہو جائے تو اُس کا سر آسمان سے جا لگے۔ مگر چاہے تو ایک لوٹے میں گھس جائے"۔
سمیع۔" سُنا ہے چودھری صاحب کے قبضہ میں بہت سے جنّات ہیں۔ کوئی چیز چوری چلی جائے۔ چودھری صاحب اس کا پتہ بتا دیں گے۔ اور چور کا نام تک بتا دیں گے جمعراتی کا بچھڑا اس دن کھو گیا تھا۔ تین دن حیران ہوئے کہیں نہ ملا تب جھک مار کر چودھری کے پاس گئے۔ چودھری نے کہا مویشی خانہ

میں ہے اور وہیں بلا۔ جنّات آکر انھیں سب خبریں دے جایا کرتے ہیں۔"

اب ہر ایک کی سمجھ میں آگیا کہ چودھری قاسم علی کے پاس کیوں اس قدر دولت ہے اور کیوں وہ قرب و جوار کے مواضعات کے مہاجن ہیں۔ جنّات آکر انہیں روپے دے جاتے ہیں۔ آگے چلئے یہ پولیس لائن ہے۔ یہاں پولیس والے قواعد کرتے ہیں۔ رائٹ، لیپ، پھام پھُو!

نوری نے تصحیح کی۔" یہاں پولیس والے پہرہ دیتے ہیں۔ جب ہی تمہیں بہت خبر ہے۔ اجی حضرت یہ لوگ چوریاں کراتے ہیں۔ شہر کے جتنے چور ڈاکو ہیں سب ان سے ملے رہتے ہیں۔ رات کو یہ سب ایک محلہ میں چوروں سے کہتے ہیں چوری کرو۔ اور دوسرے محلے میں پکارتے ہیں جاگتے رہو۔ میرے ماموں ایک تھانہ میں سپاہی ہیں۔ بیس روپے مہینہ پاتے ہیں۔ لیکن تھیلیاں بھر بھر گھر بھیجتے ہیں۔ اللہ قسم، تھیلیاں بھر بھر۔ میں نے ایک بار پوچھا تھا۔ ماموں اتنے روپے کہاں سے لاتے ہیں۔ ہنس کر کہنے لگے بیٹا اللہ دیتا ہے۔ خود ہی بعد کو کہا کہ ہم لوگ چاہیں تو ایک دن میں لاکھوں مار لائیں۔ ہم تو اتنا ہی لیتے ہیں جس میں اپنی بدنامی نہ ہو اور نوکری بنی رہے۔

حامد نے تعجب سے پوچھا۔" یہ لوگ چوری کرواتے ہیں تو انہیں کوئی پکڑتا نہیں؟"

نوری نے اس کی کوتاہ فہمی پر رحم کھا کر کہا۔" ارے احمق انہیں کون پکڑے گا پکڑنے والے تو یہ خود ہیں۔ لیکن اللہ انہیں سزا بھی خوب دیتا ہے۔ تھوڑے دن ہوئے ماموں کے گھر میں آگ لگ گئی۔ ساری متاع جل گیا۔ ایک برتن تک نہ بچا

کئی دن تک درخت کے نیچے سوئے۔ اللہ قسم! پھر نہ جانے کہاں سے قرض لائے تو برتن بھانڈے آئے۔"

بستی گھنی ہونے لگی۔ عیدگاہ جانے والوں کے مجمع نظر آنے لگے ایک سے ایک زرق برق پوشاک پہنے ہوئے کوئی تانگے پر سوار کوئی موٹر پر، چلتے تھے تو کپڑوں سے عطر کی خوشبو اُڑتی تھی۔

دہقانوں کی یہ مختصر سی ٹولی اپنی بے سروسامانی سے بے حس اپنی خستہ حالی میں مگن، صابر و شاکر چلی جا رہی تھی۔ جس چیز کی طرف تاکتے، تاکتے رہ جاتے اور پیچھے سے بار بار ہارن کی آواز ہونے پر بھی خبر نہ ہوتی۔ محسن تو موٹر کے نیچے جاتے جاتے بچا۔ وہ عیدگاہ نظر آئی۔ جماعت شروع ہو گئی ہے۔ اوپر املی کے گھنے درختوں کا سایہ ہے۔ نیچے کھلا ہوا پختہ فرش ہے۔ جس پر جاجم بچھا ہوا ہے اور نمازیوں کی قطاریں ایک کے پیچھے دوسری، خدا جانے کہاں تک چلی گئی ہیں۔ پختہ فرش کے نیچے جاجم بھی نہیں۔ کئی قطاریں کھڑی ہیں جو آتے جاتے ہیں پیچھے کھڑے ہوتے جاتے ہیں۔ آگے اب جگہ نہیں رہی۔ یہاں کوئی رتبہ اور عہدہ نہیں دیکھتا۔ اسلام کی نگاہ میں سب انسان برابر ہیں۔ دہقانوں نے بھی وضو کیا اور جماعت میں شامل ہو گئے۔ کتنی باقاعدہ منظم جماعت ہے۔ لاکھوں آدمی ایک ساتھ جھکتے ہیں۔ ایک ساتھ دوزانو بیٹھ جاتے ہیں اور یہ عمل بار بار ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا بجلی کی لاکھوں بتیاں ایک ساتھ روشن ہو جائیں اور ایک ساتھ بجھ جائیں۔ کتنا پُر احترام رعب انگیز نظارہ ہے۔ جس کی ہم آہنگی اور وسعت اور تعداد دلوں پر ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ گویا اخوت کا ایک رشتہ ان تمام رُوحوں

کو منسلک کئے ہوئے ہے۔

(۲)

نماز ختم ہوگئی ہے۔ لوگ باہم گلے مل رہے ہیں کچھ لوگ محتاجوں اور سائلوں کو خیرات کر رہے ہیں۔ جو آج یہاں ہزاروں جمع ہوگئے ہیں۔ ہمارے دہقانیوں نے مٹھائی اور کھلونوں کی دوکانوں پر یورش کی۔ بوڑھے ان دلچسپیوں میں بچوں سے کم محظوظ نہیں ہیں۔ یہ دیکھو ہنڈولا ہے ایک پیسہ دیکر آسمان پر جاتے معلوم ہوں گے کبھی زمین پر گرتے۔ یہ چرخی ہے لکڑی کے گھوڑے، اونٹ، ہاتھی میخوں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک پیسہ دیکر بیٹھ جاؤ اور پچیس چکروں کا مزہ لو۔ محمود اور محسن ہنڈولے پر بیٹھے ہیں۔ نور اور سمیع گھوڑوں پر۔ اُن کے بزرگ اتنے ہی طفلانہ اشتیاق سے چرخی پر بیٹھے ہیں۔ حامد دُور کھڑا ہے تین ہی پیسے تو اس کے پاس ہیں۔ ذرا سا چکر کھانے کے لئے وہ اپنے خزانہ کا ثالث نہیں صرف کر سکتا۔ محسن کا باپ اسے بار بار چرخی پر بلاتا ہے لیکن وہ راضی نہیں ہوتا۔ بوڑھے کہتے ہیں اس لڑکے میں ابھی سے اپنا پرایا آگیا۔ حامد سوچتا ہے کیوں کسی کا احسان لوں۔ عُسرت نے اُسے ضرورت سے زیادہ ذکی الحس بنا دیا ہے۔

سب لوگ چرخی سے اُترتے ہیں۔ کھلونوں کی خرید شروع ہوتی ہے سپاہی اور گجریا اور راجہ رانی اور وکیل اور دھوبی اور بہشتی اور سپاہی بے امتیاز ران سے ران ملائے بیٹھے ہیں۔ دھوبی راجہ رانی کی بغل میں ہے اور بہشتی وکیل صاحب کی بغل میں۔ واہ کتنے خوبصورت، بولا ہی چاہتے ہیں۔ محمود سپاہی پر لٹو ہو جاتا ہے خاکی وردی اور لال پگڑی، کندھے پر بندوق، معلوم ہوتا ہے ابھی قواعد کے لئے

چلا آرہا ہے۔ محسن کو بہشتی پسند آیا۔ کمر جھکی ہوئی ہے۔ اس پر مُشک کا دھانہ ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے ہے۔ دوسرے ہاتھ میں رسی ہے۔ کتنا بشاش چہرہ ہے۔ شاید کوئی گیت گا رہا ہے۔ مشک سے پانی ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے نوری کو وکیل سے مناسبت ہے۔ کتنی عالمانہ صورت ہے۔ سیاہ چغہ نیچے سفید اچکن، اچکن کے سینہ کی جیب میں سُنہری زنجیر، ایک ہاتھ میں قانون کی کتاب لئے ہوئے ہے معلوم ہوتا ہے۔ ابھی کسی عدالت سے جرح یا بحث کر کے چلے آرہے ہیں۔ یہ سب دو دو پیسے کے کھلونے ہیں۔ حامد کے پاس کل تین پیسے ہیں۔ اگر دو کا ایک کھلونا لیلے تو پھر اور کیا لے گا۔ نہیں کھلونے فضول ہیں۔ کہیں ہاتھ سے گر پڑے تو چور چور ہو جائے۔ ذرا سا پانی پڑ جائے تو سارا رنگ دُھل جائے۔ ان کھلونوں کو لے کر وہ کیا کرے گا۔ کس مصرف کے ہیں۔

محسن کہتا ہے۔ میرا بہشتی روز پانی دے جائیگا۔ صبح و شام۔"

محمود۔" اور میرا سپاہی گھر کا پہرہ دے گا۔ کوئی چور آئے گا تو فوراً بندوق سے فیر کر دے گا۔"

نوری۔" اور میرا وکیل روز مقدمے لڑائے گا۔ اور روز روپے لائیگا۔"

حامد کھلونوں کی مذمت کرتا ہے۔ مٹی ہی کے تو ہیں گریں تو چکنا چور ہو جائیں لیکن ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ذرا دیر کیلئے انھیں ہاتھ میں لے سکتا۔ یہ ساطی کی دوکان ہے۔ طرح طرح کی ضروری چیزیں ایک چادر پر چنی ہوئی ہے۔ گیند۔ اور سیٹیاں اور بگل اور بھونرے۔ اور ربڑ کے کھلونے اور ہزاروں چیزیں۔ محسن ایک سیٹی لیتا ہے محمود گیند۔ نوری ربڑ کا بط جو چُوں چُوں

چوں کرتا ہے۔ اور سمیع ایک خنجری اُسے بجا بجا کر رہ گا ئیگا۔ حامد کھڑا ہر ایک کو حسرت سے دیکھ رہا ہے۔ جب اس کے رفیق کوئی چیز خرید لیتے ہیں تو وہ بڑے اشتیاق سے ایک بار اُسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے کے لئے لپکتا ہے لیکن لڑکے اتنے دوست نواز نہیں ہوتے۔ خاص کر جب ابھی دلچسپی تازہ ہے۔ بچارہ یوں مایوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

کھلونوں کے بعد مٹھائیوں کا نمبر آیا کسی نے ریوڑیاں لی ہیں۔ کسی نے گلاب جامن کسی نے سوہن حلوا۔ مزے سے کھا رہے ہیں۔ حامد ان کی برادری سے خارج ہے کمبخت کی جیب میں تین پیسے تو ہیں۔ کیوں نہیں کچھ لے کر کھاتا۔ حریص نگاہوں سے سب کی طرف دیکھتا ہے۔

محسن نے کہا۔" حامد یہ ریوڑی لے جا کتنی خوشبودار ہیں۔"

حامد سمجھ گیا یہ محض شرارت ہے محسن اتنا فیاض طبع نہ تھا۔ پھر بھی وہ اُس کے پاس گیا محسن نے دونے سے دو تین ریوڑیاں نکالیں۔ حامد کی طرف بڑھائیں، حامد نے ہاتھ پھیلایا محسن نے ہاتھ کھینچ لیا اور ریوڑیاں اپنے منہ میں رکھ لیں۔ محمود اور نور اور سمیع خوب تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے۔ حامد کھسیانا ہو گیا۔

محسن نے کہا۔" اچھا اب کی ضرور دیں گے۔ یہ لیجاؤ حامد اللہ قسم۔"

حامد نے کہا۔" رکھئے رکھئے کیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

سمیع۔" تین ہی پیسے تو ہیں کیا کیا لو گے؟

محمود۔" تم اس سے مت بولو۔ حامد میرے پاس آؤ یہ گلاب جامن لے لو۔

حامد۔" مٹھائی کون بڑی نعمت ہے، کتاب میں اس کی بُرائیاں لکھی ہیں۔"

محسن :- "لیکن جی میں کہہ رہے ہو گے کہ کچھ مل جائے تو کھا لیں۔ اپنے پیسے کیوں نہیں نکالتے۔"

محمود :- "میں اس کی ہوشیاری سمجھتا ہوں۔ جب ہمارے سارے پیسے خرچ ہو جائیں گے، تب یہ مٹھائی لے گا اور ہمیں چڑا چڑا کر کھائے گا۔"

حلوائیوں کی دوکانوں کے آگے کچھ دوکانیں لوہے کی چیزوں کی تھیں کچھ گلٹ، اور ملمع کے زیورات کی۔ لڑکوں کے لئے یہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ حامد لوہے کی دوکان پر ایک لمحہ کے لئے رک گیا۔ دست پناہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ دست پناہ خریدے گا۔ ماں کے پاس دست پناہ نہیں ہے۔ توے سے روٹیاں اتارتی ہیں تو ہاتھ جل جاتا ہے اگر وہ دست پناہ لے جا کر اماں کو دیدے تو وہ کتنی خوش ہونگی۔ پھر ان کی انگلیاں کبھی نہ جلیں گی۔ گھر میں ایک کام کی چیز ہو جائے گی کھلونوں سے کیا فائدہ مفت کے پیسے خراب ہوتے ہیں۔ ذرا دیر ہی تو خوشی ہوتی ہے۔ پھر تو انہیں کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ یا تو گھر پہنچتے پہنچتے ٹوٹ پھوٹ برابر ہو جائینگے یا چھوٹے بچے جو عیدگاہ نہیں جا سکے ہیں۔ ضد کر کے لے لیں گے۔ اور توڑ ڈالیں گے دست پناہ کتنے فائدہ کی چیز ہے! روٹیاں توے سے اتار لو چولھے سے آگ نکالکر دیدو۔ اماں کو کہاں فرصت ہے بازار آئیں، اور اتنے پیسے کہاں ملتے ہیں، روز ہاتھ جلا لیتی ہیں۔ اس کے ساتھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ سبیل پر سب کے سب پانی پی رہے ہیں۔ کتنے لالچی ہیں۔ سب نے اتنی مٹھائیاں لیں کسی نے مجھے ایک بھی نہ دی۔ اس پر کہتے ہیں میرے ساتھ کھیلو۔ میری تختی دھلاؤ۔ اب اگر میاں محسن نے کوئی کام کرنے کو کہا تو خبر لوں گا۔ کھائیں مٹھائیاں۔ آپ منہ سڑیگا۔ پھوڑے پھنسیاں نکلیں گی۔

آپ ہی چٹوری زبان ہو جائے گی۔ تب پیسے چرائیں گے۔ اور مار کھائیں گے۔ میری زبان کیوں خراب ہوگی۔ اس نے پھر سوچا۔ اماں دست پناہ دیکھتے ہی دوڑ کر میرے ہاتھ سے لے لیں گی، اور کہیں گی میرا بیٹا اپنی اماں کے لئے دست پناہ لایا ہے۔ ہزاروں دعائیں دیں گی۔ پھر اسے پڑوسیوں کو دکھائیں گی۔ سارے گاؤں میں واہ واہ مچ جائے گی۔ ان لوگوں کے کھلونوں پر کون انہیں دعائیں دے گا۔ بزرگوں کی دعائیں سیدھی خدا کی درگاہ میں پہنچتی ہیں۔ اور فوراً قبول ہوتی ہیں۔ میرے پاس بہت سے پیسے نہیں ہیں۔ جب ہی تو محسن اور محمود یوں مزاج دکھاتے ہیں۔ میں بھی ان کو مزاج دکھاؤں گا۔ وہ کھلونے کھیلیں مٹھائیاں کھائیں میں غریب سہی کسی سے کچھ مانگنے تو نہیں جاتا۔ آخر ابا کبھی نہ کبھی آئیں گے ہی۔ پھر ان لوگوں سے پوچھوں گا کتنے کھلونے لو گے ایک ایک کو ایک ایک ٹوکری دوں، اور دکھا دوں کہ دوستوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا جاتا ہے۔ جتنے غریب لڑکے ہیں سب کو اچھے اچھے کرتے دلوا دوں گا اور کتابیں دیدوں گا۔ یہ نہیں کہ ایک پیسہ کی ریوڑیاں لیں تو چڑھا چڑھا کر کھانے لگے۔ دست پناہ دیکھ کر سب کے سب خوب ہنسیں گے۔ احمق تو ہیں ہی سب۔ اس نے دوکاندار سے ڈرتے ڈرتے پوچھا "یہ دست پناہ بیچو گے؟"

دوکاندار نے اس کی طرف دیکھا اور ساتھ کوئی آدمی نہ دیکھ کر کہا۔ "وہ تمہارے کام کا نہیں ہے"

"بکاؤ ہے یا نہیں"

"بکاؤ نہ ہے جی۔ اور یہاں کیوں لاد کر لائے ہیں"

"تو بتلاتے کیوں نہیں کے پیسے کا دو گے" ؟

"چھ پیسے لگیں گے۔"

حامد کا دل بیٹھ گیا۔ کلیجہ مضبوط کر کے بولا "تین پیسے لو گے؟" اور آگے بڑھا کہ دوکان دار کی گھُڑکیاں نہ سُنے۔ مگر دوکاندار نے گھُڑکیاں نہ دیں۔ دست پناہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اور پیسے لے لئے۔"

حامد نے دست پناہ کندھے پر رکھ لیا۔ گویا بندوق ہے اور شان سے اکڑتا ہوا، اپنے رفیقوں کے پاس آیا۔

محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔" یہ دست پناہ لایا ہے۔ احمق اسے کیا کرے گا؟"

حامد نے دست پناہ کو زمین پر ٹیک کر کہا" ذرا اپنا بہشتی زمین پر گرا دو، ساری پسلیاں چور چور ہو جائیں گی بچّا کی۔"

محمود۔" تو یہ دست پناہ کوئی کھلونا ہے؟"

حامد۔" کھلونا کیوں نہیں ہے۔ ابھی کندھے پر رکھا بندوق ہو گیا۔ ہاتھ میں لے لیا فقیر کا چمٹا ہو گیا۔ چاہوں تو اس سے تمھاری ناک پکڑ لوں۔ ایک چمٹا دوں تو تم لوگوں کے سارے کھلونوں کی جان نکل جائے، تمھارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ میرا بہادر شیر ہے۔ یہ دست پناہ!"

سمیع متاثر ہو کر بولا۔" میری خنجری سے بدلو گے دو آنے کی ہے۔"

حامد نے خنجری کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا۔" میرا دست پناہ چاہے تو تمھاری خنجری کا پیٹ پھاڑ ڈالے۔ بس ایک چمڑے کی جھلّی لگا دی۔ ڈھب ڈھب بولنے لگی۔ ذرا سا پانی لگے تو ختم ہو جائے۔ میرا بہادر دست پناہ آگ میں،

پانی میں، آندھی میں، طوفان میں برابر ڈٹا کھڑا رہے گا۔

میلہ بہت دُور پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ دس بج رہے تھے۔ گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اب دست پناہ نہیں مل سکتا۔ اب کسی کے پاس پیسے بھی تو نہیں رہے۔ حامد ہے بڑا ہوشیار!

اب دو فریق ہوگئے۔ محمود اور محسن اور نوری ایک طرف حامد یکہ و تنہا دوسری طرف سمیع غیر جانب دار ہے۔ جس کی فتح دیکھے، اس کی طرف جا ملیگا۔ مناظرہ شروع ہوگیا۔ آج حامد کی زبان بڑی صفائی سے چل رہی ہے۔ اتحاد ثلاثہ اس کے جارحانہ عمل سے پریشان ہو رہا ہے۔ ثلاثہ کے پاس تعداد کی طاقت ہے حامد کے پاس حق اور اخلاق، ایک طرف مٹی، ربڑ، لکڑی کی چیزیں ہیں، دوسری جانب اکیلا لوہا۔ جو اس وقت اپنے کو فولاد کہہ رہا ہے۔ وہ روئین تن ہے۔ صف شکن ہے۔ اگر کہیں شیر کی آواز کان میں آجائے تو میاں بہشتی کے اوسان خطا ہو جائیں میاں سپاہی مٹی کی بندوق چھوڑ کر بھاگیں۔ وکیل صاحب کا سارا قانون پیٹ میں سما جائے۔ چغے میں منہ چھپا کر زمین پر لیٹ جائیں۔ مگر بہادر، یہ رستم ہند لپک کر شیر کی گردن پر سوار ہو جائے گا۔ اور اس کی آنکھیں نکال لے گا۔

محسن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کہا "اچھا تمہارا دست پناہ پانی تو نہیں بھر سکتا؟"

حامد نے دست پناہ کو سیدھا کرکے کہا۔ "بہشتی کو ایک ڈانٹ بتلائے گا تو دوڑا ہوا پانی لاکر اس کے دروازے پر چھڑکنے لگے گا۔ جناب پھر اس سے چاہے گھڑے مٹکے کونڈے بھروا لو۔"

محسن کا ناطقہ بند ہوگیا۔ نوری نے کمک پہنچائی۔ بچا گرفتار ہو جائیں تو عدالت

میں بندھے بندھے پھریں گے۔ تب تو ہمارے وکیل صاحب ہی پیروی کریں گے بولئے جناب!

حامد کے پاس اس وار کا دفعیہ اتنا آسان نہ تھا۔ دفعتاً اس نے ذرا مہلت پا جانے کے ارادے سے پوچھا "اسے پکڑنے کون آئے گا؟"

محمود نے کہا یہ سپاہی بندوق والا!

حامد نے منہ چڑا کر کہا۔ یہ بچارے اس رستم ہند کو پکڑیں گے؟ اچھا لاؤ ابھی ذرا مقابلہ ہو جائے۔ اس کی صورت دیکھتے ہی بچّہ کی ماں مر جائے گی۔ پکڑیں گے کیا بچارے"

محسن نے تازہ دم ہو کر وار کیا" تمھارے دست پناہ کا منہ روز آگ میں جلے گا"

حامد کے پاس جواب تیار تھا" آگ میں بہادر کودتے ہیں۔ جناب تمھارے یہ وکیل اور سپاہی اور بہشتی ڈرپوک ہیں۔ سب گھر میں گھس جائیں گے۔ آگ میں کودنا وہ کام ہے جو رستم ہی کر سکتا ہے"

نوری نے انتہائی جودت سے کام لیا" تمہارا دست پناہ باورچی خانہ میں زمین پر پڑا رہے گا۔ میرا وکیل شان سے میز کرسی لگا کر بیٹھے گا" اس حملہ نے مُردوں میں بھی جان ڈال دی۔ سمیع بھی چیت گیا۔ بیشک بڑے معرکے کی بات کہی۔ دست پناہ باورچی خانہ میں پڑا رہے گا"

حامد نے دھاندلی کی۔ میرا دست پناہ باورچی خانہ میں نہیں رہیگا۔ وکیل صاحب کرسی پر بیٹھیں گے تو جا کر انہیں زمین پر پٹک دیگا اور سارا قانون ان کے پیٹ میں ڈال دے گا"

اس جواب میں بالکل جان نہ تھی ۔ بالکل بے تکی سی بات تھی۔ لیکن قانون پیٹ میں ڈالنے والی بات چھاگئی ۔ ایسی چھاگئی کہ تینوں سورما منہ تکتے رہ گئے ۔ حامد نے میدان جیت لیا۔ گو ثلاثہ کے پاس ابھی گیند اور سیٹی اور ربط رزرو میں تھے مگر ان مشین گنوں کے سامنے ان پٹاخوں کو کون پوچھتا۔ دست پناہ رستم ہند ہے اس میں کسی کو چون و چرا کی گنجائش نہیں ۔

فاتح کو مفتوحوں سے جو وقار اور خوشامد کا خراج ملتا ہے وہ حامد کو ملنے لگا، اور دل سے تین تین آنے خرچ کئے اور کوئی کام کی چیز نہ لے سکے ۔ حامد نے تین ہی پیسوں میں رنگ جما لیا۔ کھلونوں کا کیا اعتبار۔ دو ایک دن میں ٹوٹ پھوٹ جائیں گے ۔ حامد کا دست پناہ تو فاتح رہے گا ہمیشہ۔ صلح کی شرطیں طے ہونے لگیں۔

محسن نے کہا ۔" ذرا اپنا چمٹا دو ہم بھی دیکھیں۔ تم چاہو تو ہمارا وکیل دیکھو۔" حامد کو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے ۔ وہ فیاض طبع فاتح ہے ۔ دست پناہ باری باری سے محسن ، محمود ، نور اور سمیع سب کے ہاتھوں میں گیا ۔ اور ان کے کھلونے باری باری سے حامد کے ہاتھ میں آئے ۔ کتنے خوبصورت کھلونے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے بولا ہی چاہتے ہیں ۔ مگر ان کھلونوں کے لئے انہیں دعا کون دے گا ؟ کون کون ان کھلونوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہوگا۔ جتنا اماں جان دست پناہ کو دیکھ کر ہوں گی اُسے اپنے طرز عمل پر مطلق پچھتاوا نہیں ہے پھر اب تو دست پناہ رستم ہے اور سب کھلونوں کا بادشاہ راستے میں محمود نے ایک پیسے کی ککڑیاں لیں اس میں حامد کو بھی خراج ملا۔ حالانکہ وہ انکار کرتا رہا ۔ محسن اور سمیع نے ایک ایک پیسے کے فالسے لئے حامد کو بھی خراج ملا۔ یہ سب رستم ہند کی برکت تھی ۔

(۴)

گیارہ بجے سارے گاؤں میں چہل پہل ہو گئی۔ میلے والے آ گئے۔ محسن کی چھوٹی بہن نے دوڑ کر بہشتی اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور مارے خوشی کے جو اچھلی تو میاں بہشتی نیچے آ رہے اور عالم جاودانی کو سدھارے۔ اس پر بھائی بہن میں مار پیٹ ہوئی۔ دونوں خوب روئے۔ ان کی اماں جان یہ کہرام سن کر اور بگڑیں دونوں کو اوپر سے دو دو چانٹے رسید کئے۔ میاں نوری کے وکیل کا حشر اس سے بھی بدتر ہوا۔ وکیل زمین پر یا طاق پر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کے پوزیشن کا لحاظ تو کرنا ہی ہوگا۔ دیوار میں دو کھونٹیاں گاڑی گئیں۔ اُن پر ایک چیڑ کا پرانا پٹرا رکھا گیا۔ پٹرے پر سرخ رنگ کا ایک چیتھڑا بچھا دیا گیا جو بمنزلہ قالین تھا۔ وکیل صاحب عالم بالا پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہیں سے قانونی بحث کریں گے نوری ایک پنکھا لے کر جھلنے لگا۔ معلوم نہیں پنکھے کی ہوا سے یا پنکھے کی چوٹ سے وکیل صاحب عالم بالا سے دنیائے فانی میں آ رہے اور ان کے جسد خاکی کے پرزے پرزے ہو گئے۔ پھر بڑے زور شور کا ماتم ہوا۔ اور وکیل صاحب کی میت پارسی دستور کے مطابق گھورے پر پھینک دی گئی تاکہ بیکار نہ جا کر زاغ و زغن کے کام آ جائے۔

اب رہے میاں محمود کے سپاہی۔ محترم اور ذی رعب ہستی ہے۔ اپنے پیروں چلنے کی ذلت اُسے گوارا نہیں۔ محمود نے اپنا بکری کا بچہ پکڑا اور اس پر سپاہی کو سوار کیا۔ محمود کی بہن ایک ہاتھ سے سپاہی کو پکڑے ہوئے تھی اور محمود بکری کے بچہ کا کان پکڑ کر اسے دروازے پر ٹہلا رہا تھا اور اس کے دونوں بھائی سپاہی کی طرف سے "چھونے والے جاگتے رہو" پکارتے چلتے تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا میاں

سپاہی اپنے گھوڑے کی پیٹ سے گر پڑے اور اپنی بندوق لئے زمین پر آرہے۔ ایک ٹانگ مضروب ہوگئی۔ مگر کوئی مضائقہ نہیں۔ محمود ہوشیار ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر نگم اور بھاٹیا اس کی شاگردی کر سکتے ہیں، اور یہ ٹوٹی ٹانگ کو آناً فاناً میں جوڑ دیگا۔ صرف گولر کا دودھ چاہیئے۔ گولر کا دودھ آتا ہے ٹانگ جوڑی جاتی ہے۔ لیکن جوں ہی کھڑا ہوتا ہے ٹانگ پھر الگ ہو جاتی ہے، عمل جراحی ناکام ہو جاتا ہے۔ تب محمود اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دیتا ہے۔ اب وہ آرام سے ایک جگہ بیٹھ سکتا ہے۔ ایک ٹانگ سے تو چل نہ سکتا تھا نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اب وہ گوشہ میں بیٹھ کر ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلے گا۔

اب میاں حامد کا قصہ سنئے۔ امینہ اس کی آواز سنتے ہی دوڑی اور اُسے گود میں اٹھاکر پیار کرنے لگی دفعتاً اس کے ہاتھ میں چمٹا دیکھ کر وہ چونک پڑی۔

"یہ دست پناہ کہاں تھا بیٹا؟"

"میں نے مول لیا ہے تین پیسے میں؟"

امینہ نے چھاتی پیٹ لی۔ "یہ کیسا بے سمجھ لڑکا ہے کہ دوپہر ہوگئی نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ لایا کیا یہ دست پناہ، سارے میلے میں تجھے کوئی اور چیز ہی نہ ملی؟"

حامد نے خطاوارانہ انداز سے کہا۔ "تمھاری انگلیاں توے سے جل جاتی تھیں کہ نہیں؟"

امینہ کا غصہ فوراً شفقت میں تبدیل ہوگیا، اور شفقت بھی وہ نہیں جو پُر بیان ہوتی ہے اور اپنی ساری تاثیر لفظوں میں منتشر کر دیتی ہے۔ یہ بے زبان شفقت تھی، درد اور التجا میں ڈوبی ہوئی۔ اُف! کتنی نفس کُشی ہے۔ کتنی جاں سوزی ہے۔

غریب نے اپنے طفلانہ اشتیاق کو روکنے کے لئے کتنا ضبط کیا ہوگا۔ جب دوسرے لڑکے کھلونے لے رہے ہوں گے، مٹھائیاں کھا رہے ہوں گے۔ اس کا دل کتنا لہراتا ہوگا۔ اتنا ضبط اس سے ہوا کیونکر! اپنی بوڑھی اماں کی یاد اسے وہاں بھی رہی میرا لال میری کتنی فکر رکھتا ہے۔ اس کے دل میں ایک ایسا علوی جذبہ پیدا ہوا کہ اس کے ہاتھ میں دنیا کی بادشاہت آجائے اور وہ اسے حامد کے اوپر نثار کر دے۔

اور تب ایک بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ بڑھیا امینہ ننھی سی امینہ بن گئی۔ وہ رونے لگی۔ دامن پھیلا کر حامد کو دعائیں دیتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو کی بڑی بڑی بوندیں گراتی جاتی تھی۔ حامد اس کا راز کیا سمجھتا اور نہ شاید ہمارے بعض ناظرین ہی سمجھ سکیں گے۔

عصمت سالگرہ نمبر ۱۹۳۳ء

سکونِ قلب

(۱)

مرحوم سری ناتھ میرے بے تکلف دوستوں میں تھے۔ آج بھی جب اُن کی یاد آجاتی ہے تو وہ پُر لطف صحبتیں آنکھوں میں پھر جاتی ہیں اور ذرا دیر رو لیتا ہوں۔
ہمارے درمیان دو ڈھائی سو میل کا فاصلہ تھا۔ میں لکھنؤ میں وہ دہلی میں مگر شاید ہی کوئی ایسا مہینہ گذرتا ہو کہ ہم آپس میں نہ مل جاتے۔ آزاد روشن خیال، زندہ دل، یارباش وفا پرور آدمی تھے، جس نے اپنے اور پرائے میں کبھی امتیاز نہیں کیا۔ دنیا کیا چیز ہے اور یہاں ظاہر داریوں کا کیسے نباہ ہوتا ہے۔ یہ اس شخص نے کبھی نہ جاننے کی کوشش کی۔ زندگی میں ایسے موقعے بار بار آئے۔ جب انہیں آئندہ کے لئے عبرت ہونی چاہئے تھی۔ دوستوں نے انکی علو ہمتی سے نا جایز فائدے اٹھائے۔ کئی بار شرمندگی بھی ہوئی۔ لیکن اس مرد خدا نے زندگی سے کوئی سبق لینے کی قسم کھالی تھی۔ اس کی روش میں کوئی تغیر نہ ہوا۔ وہ جیسے سہل اعتقاد جئے ویسے ہی سہل اعتقاد مرے۔ جس وقت میں وہ رہتے تھے وہ نرالی دنیا تھی۔ جس میں بدگمانی اور دُور اندیشی اور حیلہ سازی کا شائبہ تک نہ تھا۔ سب اُن کے اپنے تھے کوئی غیر نہ تھا۔ میں نے انھیں حقائق زندگی سے

متنبہ کرنے کی بار بار کوشش کی۔ مگر اس کا اثر ہمیشہ توقع کے خلاف ہوا۔ وہ کبیدہ خاطر ہو جاتے اور معلوم ہوتا تھا کہ انہیں مصلحت آمیزانہ خیراندیشیوں سے رُوحانی صدمہ ہوتا ہے۔ مجھے اکثر یہ فکر ہوتا تھا کہ ان کی فیاضیوں کا یہی حال رہا تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اُنکی بیوی گویا بھی کچھ اس سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ ہماری دیویوں میں جو احتیاط عموماً برتی جاتی ہے اور ہمیشہ ایسے لااُبالی مزاج مردوں کی کم اندیشیوں پر ہر ایک کام کرتی ہے۔ وہ گویا مفقود تھی، یہاں تک کہ اُسے زیور اور کپڑوں سے بھی کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ چنانچہ جب مجھے سری ناتھ کی وفات کی خبر ملی اور میں دہلی گیا تو گھر میں بجز برتن بھانڈے اور مکان کے کوئی اثاثہ باقی نہ تھا اور ابھی مرحوم کی عمر ہی کیا تھی، چالیس سال بھی تو پورے نہ ہوئے تھے۔ پہلے ایک لڑکی ہوئی تھی اس کے بعد دو لڑکے تو کم عمر ہی میں داغ دے گئے۔ لڑکی بچ رہی تھی۔ اُس کا چودہواں سال تھا اور یہی اس ناٹک کا سب سے دردناک حصہ تھا جس معاشرت کا یہ کنبہ عادی تھا۔ اس کے لئے اس اختصار کے باوجود کم سے کم سو روپیہ ماہوار کی ضرورت تھی اور آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں اور دو ڈھائی سال میں لڑکی کی شادی بھی کرنی ہے۔ اس کی سبیل ہوگی۔ میری عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ مجھے اس وقت یہ بیش بہا تجربہ ہوا کہ جو لوگ واقعی بے لوث اور نیک طینت اور دوست پرور ہوتے ہیں اور قرض سے ہمیشہ پاک رہتے ہیں۔ اُن کے پسماندوں کو آڑ دینے والوں کی کمی نہیں رہتی۔ یہ کوئی عام قاعدہ نہیں ہے۔ میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے، جنہوں نے زندگی میں بہتوں کے ساتھ سلوک کئے۔ مگر ان کے بعد کسی نے ان کے عیال کی بات تک نہ پوچھی، لیکن چاہے کچھ بھی ہو۔ سری ناتھ کے احباب نے قابلِ تعریف وفاداری سے کام لیا۔ اور گویا کے گذران کے لئے

ایک مستقل رقم جمع کر دینے کی تجویز کی اور ایک صاحب تو اس سے شادی کرنے کو بھی تیار تھے۔ مگر گوپا نے اس خودداری کا ثبوت دیا جو ہماری دیویوں کا جوہر ہے اور کسی کی دستِ نگر نہ بنی اس نے اپنے مکان کا بڑا حصہ کرایہ پر اٹھا دیا اور خود اس کے ایک حصہ میں گذارا کرنے لگی۔ پچیس روپے اس کے لئے کافی تھے۔ لڑکی ایک مدرسہ میں پڑھتی تھی جو کچھ خرچ تھا اُس کی ذات سے تھا گوپا کے لئے تو اب زندگی میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

(۲)

اس کے ایک ہی مہینے بعد مجھے کاروبار کے سلسلہ میں یورپ جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں مجھے امید کے خلاف دو سال لگ گئے وہاں میں برابر گوپا سے خط وکتابت کرتا رہتا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کی زندگی اطمینان سے بسر ہو رہی ہے، تردد کا کوئی موقع نہیں ہے۔ حالانکہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ گوپا نے یہاں بے ضرورت پردہ داری برتی اور مجھے غیر سمجھ لیا۔ انگلینڈ سے واپس آنے پر میں سیدھا دلی پہنچا۔ دروازہ پر پہنچتے ہی مجھے بے اختیار رونا آگیا ذرو دیوار سے حسرت برس رہی ہے۔ جس کمرے میں احباب کے جمگھٹے رہتے تھے، اس کے دروازے بند تھے، اور مکڑیوں کے جالے ان کی پاسبانی کر رہے تھے۔ مرحوم کی وہ مانوس آواز جسے سن کر میں اپنے سارے غم بھول جاتا تھا۔ اس کی جگہ ایک ماتمی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ سری ناتھ دروازے پر کھڑے میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں، میں باطل پرست نہیں ہوں اور ارواح کی جسمانیت میں مجھے شبہ ہے، لیکن اس وقت ذرا دیر کے لئے میں چونک ضرور پڑا اور میرے دل میں ایک ارتعاش سا ہونے لگا لیکن دوسری نظر میں وہ صورت غائب ہو چکی تھی۔ میں نے زنجیر کھٹکائی دروازہ

کھلا۔ گوپا کے سوا کھولنے والا ہی کون تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر دل تھام لیا اگرچہ اُسے میرے آنے کی خبر تھی اور آج میری آمد کے انتظار میں اس نے نئی، ساڑی پہن لی تھی اور شاید بالوں میں کنگھی بھی کر لی تھی۔ لیکن ان دو برسوں میں قدرت نے اس کے ساتھ جو ستم کیا تھا اُسے کیا کرتی۔ یہ وہ بن ہے، جب حُسن اپنے پورے شباب پر آتا ہے۔ جب اس میں بے نیازی اور اَلھڑپن اور استغنا کی جگہ کشش اور حلاوت پیدا ہو جاتی ہے، لیکن گوپا بوڑھی ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر جُھرّیاں تھیں جسے ازادی بشاشت بھی دُور نہ کر سکتی تھی۔ بالوں پر سفیدی دوڑ چلی تھی۔ اور ایک ایک عضو خستہ حالی کی شہادت دے رہا تھا۔ سوگوار آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

میں نے رقّت آمیز لہجہ میں پوچھا "کیا تم بیمار تھیں گوپا؟"

گوپا نے جواب دیا۔ "نہیں تو مجھے سر کا درد بھی کبھی نہیں ہوا۔"

"تو تمھاری یہ کیا حالت ہے بالکل بوڑھی ہو گئی ہو؟"

"تو اب جوانی لے کر کیا کروں گی۔ میری عمر بھی تو پینتس سے اوپر ہو گئی۔"

"پینتس کی عمر تو بہت زیادہ نہیں ہوتی۔"

"ہاں ان کے لئے جو بہت جینا چاہتے ہیں۔ میں تو چاہتی ہوں جتنی جلدی ہو سکے زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ بس سنی کے بیاہ کی فکر ہے۔ اس سے نجات پا جاؤں پھر مجھے زندگی کی پرواہ نہ رہے گی۔"

اب معلوم ہوا کہ جو صاحب اس گھر میں کرایہ دار ہوئے وہ چند مہینوں کے بعد تبدیل ہو کر چلے گئے اور جب سے کوئی دوسرا کرایہ دار نہ آیا۔ میرے دل میں برچھی سی چُبھ گئی۔ ان دو برس تک ان غریبوں کی کیونکر بسر ہوئی۔ یہ خیال ہی جگر دوز تھا۔

میں نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا " لیکن تم نے مجھے ان حالات کی بالکل اطلاع نہ دی، تم نے مجھے بالکل غیر سمجھ لیا "

گوپا نے نادم ہو کر کہا " میں نے سمجھا تم پردیس میں خود ہی پریشانیوں میں مبتلا ہو گے۔ تمھیں کیوں ستاؤں۔ کسی نہ کسی طرح دن کٹ گئے۔ گھر میں اور کچھ نہ تھا تو تھوڑے سے زیور تو تھے ہی، اب سینا کی شادی کی فکر ہے۔ پہلے میں نے سمجھا تھا۔ اس مکان کو بیع کر دوں گی۔ بیس بائیس ہزار مل جائیں گے۔ شادی بھی ہو جائے گی اور شاید کچھ میرے لئے بچ رہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ مکان پہلے ہی رہن ہو چکا ہے اور اصل اور سود مل کر بیس ہزار ہو گیا ہے۔ مہاجن کی اتنی ہی عنایت کیا کم تھی کہ مجھے گھر سے نکال دیا۔ اس لئے اب اِدھر سے بھی کوئی اُمید نہیں ہے۔ شاید منت سماجت کرنے پر دو ہزار اور مل جائیں، اتنے میں کیا ہو گا۔ اسی فکر میں گھلی جا رہی ہوں، لیکن میں بھی کتنی خود غرض ہوں تمھیں ہاتھ دھونے کو پانی بھی نہ دیا۔ کچھ ناشتہ بھی نہ لائی۔ اور اپنا دکھڑا لے بیٹھی۔ اب کپڑے اُتار دیئے۔ کچھ کھانے کو پکاؤں۔ کھا پی لیجئے، تب باتیں ہوں۔ مکان پر تو سب خیریت ہے؟"

میں نے کہا " میں تو سیدھا بمبئی سے یہاں آ رہا ہوں۔ گھر کہاں گیا "

گوپا نے مجھے ملامت آمیز آنکھوں سے دیکھا۔ مگر اس ایک جملہ میں خدا جانے کیا جادو تھا۔ معجزہ تھا، اس کے چہرے کی ساری جھرّیاں مٹ گئیں اور زرد چہرہ پر ایک ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ اور ملامت میں کتنا استحسان کتنی محبت کتنا اعتماد کتنی مسرت بھری ہوئی تھی۔ وہ حُسن جو کس مپرسی اور عسرت اور بے نوائی کے ہاتھوں پامال

ہو رہا تھا نمودار ہو گیا۔

"اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمھاری دیوی جی تمہیں کبھی یہاں نہ آنے دیں گی۔"

"میں کسی کا غلام نہیں ہوں۔"

"کسی کو اپنا غلام بنانے کے لئے خود بھی اس کا غلام بننا پڑتا ہے۔"

شام ہو رہی تھی جاڑوں کے دن تھے مُنیتا مدرسے سے آئی دو سال پہلے کی اُلھڑ چھوکری، اس وقت حسین اور خوش قامت لڑکی تھی جس کی ہر ایک جنبش ہر ایک نگاہ ہر ایک بات ایک ادا تھی، جسے میں گود میں اُٹھا کر پیار کرتا تھا۔ اس کی طرف آنکھیں نہ اُٹھا سکا۔ اور وہ جو میرے گلے سے لپٹ کر خوش ہوتی تھی۔ آج میرے سامنے کھڑی بھی نہ رہ سکی۔ جیسے مجھ سے کوئی چیز چھپانا چاہتی ہے۔ اور جیسے میں اس چیز کو چھپانے کا موقع دے رہا ہوں۔

"میں نے پوچھا" اب تم کس درجہ میں پہنچیں سُنی؟"

اُس نے سَر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ "دسویں میں ہوں۔"

"گھر کا بھی کچھ کام کاج کرتی ہو؟"

"اماں جب کرنے بھی دیں۔"

گوپا بولی "میں ہی نہیں کرنے دیتی یا تو خود کسی کام کے قریب نہیں جاتی۔"

سُنی منہ پھیر کر ہنستی ہوئی چلی گئی۔ ماں کی دُلاری لڑکی تھی، جس دن وہ رسوئی میں جا کر کچھ کام کرتی، اُس دن شاید گوپا رو رو کر آنکھیں پھوڑ لیتی، وہ خود لڑکی کو کوئی کام نہ کرنے دیتی تھی، مگر سب سے شکایت کرتی تھی کہ وہ کوئی کام نہیں کرتی۔ شکایت بھی اس کے پیار کا ہی ایک کرشمہ تھی۔

میں کھانا کھا کر لیٹا تو گوپا نے سُنی کی تیاریوں کا ذکر شروع کیا۔ اس کے سوا اس کے پاس اور بات ہی کیا تھی۔ لڑکے تو بہت ملتے تھے، لیکن کچھ حیثیت بھی تو ہو۔ لڑکی کو یہ سوچنے کا موقع کیوں ملے کہ دادا زندہ ہوتے تو شاید میرے لئے زیادہ اچھا گھر تلاش کرتے۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے لالہ مداری لال کے لڑکے کا ذکر کیا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا لالہ مداری لال پہلے اکزیکٹیو انجنیر تھے۔ اب پنشن پاتے تھے۔ لاکھوں روپے جمع کر لئے تھے پر اب تک حرص کی پیاس نہ بجھی تھی۔ ساری دنیا کی دولت کھینچکر اپنے گھر میں بھر لینا چاہتے تھے، گوپا نے گھر بھی وہ چھانٹا جہاں اس کی رسائی مشکل تھی، [illegible] نے اعتراض کیا لالہ داری لال تو بڑے بدماغ آدمی ہیں۔

گوپا نے تردید کی نہیں تم سے ابھی انہیں پہچانا نہ ہوگا۔ میرے اوپر بہت مہربان ہیں۔ کبھی کبھی آکر خیر و عافیت پوچھ جاتے ہیں۔ لڑکا ایسا قبول صورت ہے کہ میں تم سے کیا کہوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھگوان نے اُسے سُنی ہی کے لئے بنایا ہے۔ انجنیر صاحب نے تو یہاں تک کہدیا ہے کہ میں تم سے جہیز وغیرہ نہیں چاہتا۔ میں نے سمجھا وہ سہل اعتقادی جس نے سری ناتھ کو تباہ کیا گوپا پر بھی غالب ہے۔ میں نے بھی خیال کیا کہ کیوں کسی سے بدگمانی کروں، ممکن ہے مداری لال کی طبیعت دولت سے سیر ہو گئی ہو۔ میں نے نیم راضی ہو کر کہا "مگر یہ تو سوچو کہ ان کی حیثیت تم سے کتنی زیادہ ہے۔ شاید تم اپنا سب کچھ قربان کر کے بھی ان کا منہ نہ سیدھا کر سکو لیکن گوپا کے دل میں بات جم گئی تھی۔ مداری لال نے اس پر جادو ڈال دیا تھا۔ سُنی کو وہ ایسے گھر میں بیاہنا چاہتی تھی جہاں وہ رانی بن کر رہے۔

گویا نے میری باتوں پر التفات نہ کیا بولی۔ "مداری لال بہت ہی شریف اور بے لوث آدمی ہیں۔ تم ان سے مِل کر خوش ہوگے۔ صبح ان کے پاس جا کر اس معاملہ کو طے کرو۔ میں اب تک ان سے صاف کچھ نہیں کہہ سکی۔ لیکن مجھے امید ہے کہ جہیز کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ میں بیوہ ہوں، غریب ہوں، بیکس ہوں مجھ پر رحم کریں گے۔"

دوسرے دن سویرے میں لالہ مداری لال کے پاس گیا اور ان سے میری گفتگو ہوئی اسی نے مجھے ان کا مدّاح بنا دیا۔ کسی زمانے میں وہ سخت گیر رہتے ہونگے اس وقت تو بہت منکسر المزاج، بے حد خلیق، نہایت وضعدار بزرگ تھے، بولے بھائی صاحب میں سری ناتھ جی سے واقف ہوں۔ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ ان کی لڑکی میرے گھر میں آئے یہ میری خوش نصیبی ہے، آپ اس کی ماں سے کہدو کہ مداری لال ان سے کسی چیز کا طالب نہیں، ایشور کا دیا ہوا میرے گھر میں بہت کچھ ہے وہ کوئی تردّد نہ کریں میں انہیں زیر بار نہیں کرنا چاہتا وغیرہ۔

میرے دل سے بوجھ اتر گیا۔ ہم سُنی سنائی باتوں سے دوسروں کے متعلق کتنی غلط رائے قائم کر لیا کرتے ہیں۔ اس کا خوش گوار تجربہ ہوا۔ میں خوش لوٹا اور گویا کو اس خوش قسمتی پر مبارکباد دی۔ یہ فیصلہ ہوا کہ گرمیوں میں شادی ہو جائے۔ اسی دن میں لکھنؤ چلا گیا۔

(۴)

یہ چار مہینے گویا نے شادی کی تیاریوں میں صرف کئے۔ میں مہینہ میں ایک بار ضرور صاسنے حق آتا تھا۔ لیکن ہر بار غمزدا کے اثر لے کر آتا۔ گو پا نے اپنی خاندانی

عظمت کا خدا جانے کیا معیار، دل میں قائم کر لیا تھا۔ غریب اس وہم میں پڑی ہوئی تھی کہ اس کی علو ہمتی شہر میں اپنی یادگار چھوڑ جائے گی۔ یہ نہ جانتی تھی کہ یہاں ایسے تماشے روز ہوتے ہیں اور دوسرے ہی دن بھلا دیئے جاتے ہیں۔ شاید وہ دنیا سے یہ خراج لینا چاہتی ہے کہ اس بے نوائی اور بے سروسامانی میں بھی لٹا ہوا ہاتھی نولاکھ کا ہے قدم قدم پہ اُسے سری ناتھ کی یاد آتی وہ ہوتے تو یہ کام یوں ہوتا، یوں نہ ہوتا۔ اور پھر وہ روتی۔ مداری لال شریف آدمی ہیں اس سے کسی چیز کے خواستگار نہیں لیکن اس کا بھی تو لڑکی کے ساتھ کچھ فرض ہے۔ سُنی کے لئے اس نے جتنے زیور اور جوڑے تیار کئے انھیں دیکھ کر حیرت ہوتی تھی جب دیکھئے کچھ نہ کچھ سی رہی ہے۔ کبھی سناروں کی دوکان پر بیٹھی ہوئی ہے۔ کبھی بازار سے مہانوں کی ضیافت کے سامان خرید رہی ہے محلّے میں شاید ہی ایسا کوئی خوش حال آدمی تھا جس سے اس نے قرض نہ لیا ہو۔ وہ اسے قرض سمجھتی تھی۔ مگر دینے والے امداد سمجھ کر دیتے تھے۔ سارا محلہ اس سے ہمدردی کر رہا تھا سُنی اب محلہ کی لڑکی تھی۔ گو پا کی عزّت کے ساتھ محلّے والوں کی عزّت بھی وابستہ ہے اور گو پا کے لئے تو نیند اور آرام حرام۔ درد سے سر پھٹا جا رہا ہے۔ آدھی رات ہو گئی ہے۔ مگر وہ بیٹھی کچھ نہ کچھ سی رہی ہے کتنا بلند حوصلہ تھا کسی بات کی مطلق پروانہ کرتی۔ اکیلی عورت اور وہ بھی نیم جاں اور نحیف کیا کیا کرے۔ جو کام خود نہیں کرتی اسی میں کچھ نہ کچھ کسر رہ جاتی ہے۔ مگر اس کی ہمت ہے کہ کسی طرح نہیں ہارتی پچھلی بار کی ملاقات میں بھی اس کی حالت دیکھ کر مجھے بڑی فکر ہوئی۔ میں نے کہا گو پا اگر مرنا ہی چاہتی ہو تو شادی ہو جانے کے بعد مرو۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں اس سے قبل ہی پروانہ نہ آ جائے۔

گوپا کا پژمردہ چہرہ کھل اٹھا۔ بولی۔ اس کی فکر نہ کرو بھیا۔ بیوہ بڑی سخت جان چیز ہے۔ لیکن آرزو یہی ہے کہ سُنی کا ٹھکانہ لگا کر میں بھی چل دوں، اب اور جی کر کیا کروں گی۔ کیا کروں اگر کسی طرح کی بے عنوانی ہوئی تو کس کی بدنامی ہوگی۔ ان چار مہینوں میں مشکل سے رات کو ایک گھنٹے سوئی ہوں گی۔ نیند ہی نہیں آتی۔ مگر میرا دل خوش ہے، میں مروں یا جیوں مجھے اطمینان تو ہوگا۔ کہ سُنی کے لئے جو کچھ کر سکتی تھی وہ میں نے کر دیا۔ مداری لال نے شرافت کا ثبوت دیا تو مجھے بھی ان کی شرافت کا جواب دینا ہے۔

اسی وقت ایک دیوی نے آکر گوپا سے کہا بہن چل کر ذرا دیکھ لو چاشنی ٹھیک ہوگئی ہے یا نہیں۔ گوپا اس کے ساتھ چاشنی کا معائنہ کرنے گئی اور ایک لمحہ کے بعد آکر بولی جی چاہتا ہے سر پیٹ لوں تم سے ذرا باتیں کرنے لگی، ادھر چاشنی اتنی سخت ہوگئی کہ لڈو دانتوں سے مڑیں گے۔ کس سے کیا ہوں، میں نے کہا تم ناحق یہ دردسری مول لے رہی ہو، کیوں نہیں کسی حلوائی کو بلا کر مٹھائیوں کا ٹھیکہ دیدیتیں پھر تمہارے یہاں مہمان ہی کتنے آئیں گے۔ جن کے لئے یہ طومار باندھ رہی ہو، دس پانچ روپے کی مٹھائی اُن کے لئے کافی ہوگی۔

گوپا نے میری طرف دردناک آنکھوں سے دیکھا اُن میں آنسو کے قطرے بھرے ہوئے تھے۔ بھیا تم یہ باتیں نہ سمجھو گے۔ تمھیں نہ ماں بننے کا اتفاق ہوا، نہ بیوی بننے کا۔ سُنی کے باپو جی کا کتنا نام تھا۔ ان کی کتنی عزت تھی، کتنے آدمیوں کو ان سے فیض پہنچتا تھا۔ وہ پگڑی میرے ہی تو سر بندھی ہے، تمھیں شاید یقین نہ آئے، مگر میں تو انہیں ہمیشہ اپنے اندر بیٹھا ہوا پاتی ہوں۔ جو کچھ کر رہے ہیں وہ کر رہے ہیں۔ میں

بے عقل عورت اکیلی کیا کر لیتی ۔ وہی میرے رہبر ہیں ۔ وہی میرے مشیر ہیں ۔ وہی میرے مددگار ہیں ۔ یہ سمجھ لو کہ یہ قالب میرا ہے لیکن اس کے اندر جو روح ہے وہ ان کی ہے ۔ تم ان کے دوست ہو لیکن تم نے اپنے سینکڑوں روپے بھی خرچ کئے اور داد و دہش بھی کر رہے ہو ۔ میں تو ان کی بیوی ہوں دنیا میں بھی اور عاقبت میں بھی ۔
یہ سنکر میں لاجواب ہو گیا ۔

(۴)

جون میں شادی ہو گئی ۔ گوپا نے بہت کچھ دیا ۔ اور اپنی حیثیت سے بہت زیادہ دیا ۔ لیکن اسے تسکین نہ تھی ۔ آج سُنی کے دادا ہوتے تو نہ جانے کیا کرتے برابر روتی رہی ، جاڑوں میں ، میں پھر دہلی گیا ۔ میں نے سمجھا تھا کہ اب گوپا خوش ہوگی لڑکی اچھے گھر میں پہنچ گئی ہے ۔ اور آرام سے ہے ۔ گوپا کے لئے اس کے سوا اور کیا چاہئے ۔ لیکن خوشی شاید اس کی تقدیر میں نہ تھی ۔

میں اطمینان سے بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے شکایتوں کا دفتر کھول دیا ۔ گھر بار سب اچھا ہے ، ساس سسر بھی اچھے ہیں ۔ لیکن داماد آوارہ مزاج ہے ۔ سُنی بچاری رو رو کر دن کاٹ رہی ہے ۔ تم اسے دیکھو تو پہچان نہ سکو ۔ بالکل سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے ۔ ابھی کئی دن ہوئے آئی تھی جیسے زندگی میں اپنا راستہ کھو بیٹھی ہو نہ تن بدن کی سدھ ہے نہ کپڑے لتے کی ، میری سُنی کی یہ حالت ہو گئی اس کا تو مجھے خواب میں بھی گمان نہ تھا ۔ بالکل گم سم ہو گئی ہے ۔ کتنا پوچھا بیٹی وہ تجھ سے کس بات سے ناراض ہے ۔ لیکن جواب ہی نہیں دیتی ۔ آنکھوں سے آنسو گرتے رہتے ہیں میری سُنی کنوئیں میں گر گئی ۔

میں نے پوچھا " لیکن اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی ہی تم نے کسی اور سے نہیں دریافت کیا "

گوپا بولی ۔ " پوچھا کیوں نہیں بھیّا۔ سب حال معلوم ہوگیا۔ وہ کہتا ہے میں ہرجا ہے کروں مگر سُنّی میری پوجا کرتی رہے۔ سنّی بھلا اسے کیوں برداشت کرنے لگی۔ اسے تو تم جانتے ہو کتنی خوددار لڑکی ہے وہ ان عورتوں میں نہیں ہے جو شوہر کو دیوتا سمجھتی ہیں اور اس کی ہر ایک جا بیجا حرکت کو برداشت کرتی ہیں۔ اس نے ہمیشہ لاڈ اور پیار پایا ہے، باپ بھی ہمیشہ اس پر جان دیتا تھا۔ میں بھی اس کی ناز برداری کرتی تھی۔ شوہر ملا رنگین مزاج جو آدھی آدھی رات تک مارا مارا پھرتا ہے۔ دونوں میں نہ معلوم کیا بات ہوئی۔ لیکن مجھے تو ایسا اندیشہ ہورہا ہے کہ دونوں میں کوئی گانٹھ پڑگئی ہے۔ نہ وہ سُنّی کی پرواہ کرتا ہے نہ سُنّی اس کی پروا کرتی ہے۔ مگر وہ تو اسی طرح اپنے رنگ میں مست ہے۔ سُنّی رو رو کر آنکھیں پھوڑے ڈالتی ہے۔

میں نے کہا لیکن تم نے سُنّی کو سمجھایا نہیں، لڑکے کا کیا بگڑ گیا وہ تو کل دوسری شادی کرلیگا۔ سُنّی کی زندگی تو خراب ہوجائے گی۔ گوپا کی آنکھوں سے آنسو چھلک آئے بھیّا۔ کس دل سے سمجھاؤں اسے دیکھ کر تو میری چھاتی پھٹنے لگتی ہے بس یہی جی چاہتا ہے کہ اسے اپنے کلیجے میں رکھ لوں کہ اسے کوئی گرم آنکھ سے دیکھ ہی نہ سکے۔ سُنّی آرام طلب ہوتی، بدسلیقہ ہوتی۔ تُند مزاج ہوتی تو سمجھاتی بھی۔ کیا یہ سمجھاؤں کہ تیرا شوہر گلی گلی آوارہ پھرتا پھرے پھر بھی تو اسکی پوجا کیا کر، میں کیا یہ ذلّت پسند کرتی۔ میاں بیوی میں نباہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ دونوں بالکل ایک ہوجائیں۔ ایسے مرد تو بہت کم ہیں جو عورت میں جوہر انحراف بھی گوارا کرسکیں، لیکن ایسی عورتیں بھی ہیں جو

شوہر کو آزاد سمجھتی ہیں۔ سُنی ان عورتوں میں نہیں ہے۔ وہ اگر دل و جان شوہر کی نذر کرتی ہے تو یہ چاہتی ہے کہ وہ اپنا دل و جان اس کی نذر کرے اور اگر شوہر بے وفا ہو تو اس سے کوئی تعلق نہ رکھے گی چاہے اس کی زندگی رو رو کٹے۔

مجھ سے یہ کہہ کر گوپا اندر گئی اور ایک صندوقچہ اُٹھا لائی اور اس کے اندر کے زیور دکھا کر بولی "سُنی اب کے اسے یہیں چھوڑ گئی۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو میں نے نہ جانے کن کن پریشانیوں سے بنوائی تھیں، ان کے پیچھے مہینوں ماری ماری پھری تھی سُنی اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ پہنے تو کس کے لئے سنگار کرے تو کس پر، پانچ صندوق کپڑوں کے دیئے تھے۔ کپڑے سیتے سیتے میری آنکھیں پھوٹ گئیں۔ سُنی اب کے سارے کپڑے اُٹھا لائی۔ ان چیزوں سے جیسے اسے نفرت ہو گئی ہے۔ بس ہاتھ میں دو کانچ کی چوڑیاں اور معمولی ساری یہی اس کا سنگار ہے۔

میں نے گوپا کو تشفی دیتے ہوئے کہا کہ "میں جا کر ذرا سُنی کے شوہر سے ملونگا اور اُسے سمجھا بجھا کر راستے پر لانے کی کوشش کروں گا۔

گوپا نے میری طرف ہاتھ جوڑ کر کہا۔" نہیں بھیّا بھول کر بھی نہ جانا سُنی سُنے گی تو جان ہی دیدے گی۔ بڑی مغرور ہے وہ بیحد مغرور ہے اسے رسّی سمجھ لو جس کے جل جانے پر بھی بل نہیں جاتا۔ جن پیروں نے اُسے ٹھکرایا ہے انہیں وہ کبھی نہ سہلائے گی۔ اسے اپنا بنا کر کوئی چاہے تو لونڈی بنا لے لیکن حکومت تو اس نے میری نہیں برداشت کی دوسروں کی کیا کرے گی۔ میں نے گوپا سے تو اس وقت کچھ نہ کہا۔ لیکن موقعہ ملتے ہی لالہ مداری لال کے پاس گیا۔ میں چاہتا تھا کہ اصلی کیفیت کا پتہ لگاؤں۔ اتفاق سے لالہ صاحب اور ان کے صاحبزادے کیدار دونوں ایک ہی جگہ مل گئے، شاید ان میں کسی

مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کیدار نے اس طرح جھک کر میرے قدم چھوئے کہ میں اس کی سعادتمندی پر فریفتہ ہو گیا۔ چائے پان مٹھائی اور مربّے سے میری خاطر کی، اتنا مؤدب، اتنا شائستہ اور سلیم الطبع نوجوان میری نظر سے نہ گذرا تھا۔ یہ گمان ہی نہ ہو سکتا تھا کہ یہ شخص ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ اور ہو سکتا ہے۔ جب میں کچھ پوچھتا بڑے ادب سے سر جھکا کر جواب دیتا۔ اور بلا ضرورت ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالتا۔

جب کیدار ٹینس کھیلنے چلا گیا تو میں نے لالہ مداری لال سے کہا کہ مجھے تو کیدار بابو بہت شائستہ مزاج معلوم ہوتے ہیں۔ پھر میاں بیوی میں کیوں یہ بدمزگی پیدا ہو گئی ہے مداری لال نے تامل کے ساتھ کہا اس کا سبب اس کے سوا اور کیا بتاؤں کہ دونوں اپنے ماں باپ کے لاڈلے ہیں اور پیار بچوں کو شوریدہ سر بنا دیتا ہے۔ میری ساری زندگی کشمکش میں گذری۔ اب ضعیفی میں جا کر ذرا اطمینان نصیب ہوا ہے۔ نفس پروری کا کبھی موقع نہ ملا۔ دن بھر مزدوری کرتا تھا۔ شام کو پڑ کر سو رہتا تھا۔ صحت خراب تھی ہی ہمیشہ یہ فکر سوار رہتا تھا کہ کچھ جمع کر لوں ایسا نہ ہو کہ میرے بعد بیوی بچے دوسروں کے دست نگر ہو جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان حضرت کو مفت کی دولت ملی جو فرمائش کرتے تھے وہ پوری ہو جاتی تھی۔ ڈراما کھیلنے کا شوق پیدا ہوا اس پر ہزاروں روپے پھونک دیئے، پڑھنا لکھنا تو درکنار بس ڈرامہ کی دُھن رہنے لگی، رنگ اور گہرا ہوا اپنی زندگی کا ڈرامہ کھیلنے لگے۔ میں نے یہ دیکھا تو سوچا کہ جلدی سے شادی کر دوں۔ راہ راست پر آجائے گا گو پا دیوی نے پیغام دیا تو میں نے فوراً منظور کر لیا۔ میں نے اُن کی لڑکی کو دیکھا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ ایسی حسین بیوی پا کر اس کی طبیعت یکسو ہو جائیگی۔

مگر وہ بھی لاڈلی لڑکی تھی، زمانہ کے نشیب و فراز سے ناواقف رواداری کی حقیقت سے محروم، وہ احتراز سے اسے زیر کرنا چاہتی ہے؛ یہ بے اعتنائی سے ہیں تو صاحب اس معاملہ میں بہو کو زیادہ خطاوار سمجھتا ہوں۔ لڑکوں میں بالعموم ذمہ داری کا خیال کم ہوتا ہے۔ لڑکیاں فطرتاً زیادہ ذمہ دار ہوتی ہیں اور اپنی خدمت اور قربانی سے شوہر کو اپنی جانب مائل کر لیتی ہیں۔ بہو میں یہ بات نہیں، بس یہی بدمزگی کا سبب ہے۔ بظاہر دونوں بڑے مہذب بڑے نیک بڑے متحمل مزاج، لیکن ایک کے باطن میں خودداری اور تکبّر کا جنون ہے دوسرے کے باطن میں آزاد روی۔ کج فہمی کا فتور کشتی کیسے پار ہوگی یہ خدا ہی جانے۔"

یکایک سُنی اندر سے آگئی۔ چہرہ زرد، آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے گویا جسم میں خون ہی نہیں ہے۔ پامال آرزؤں کی اس سے بہتر تصویر نہیں ہوسکتی شکوہ آمیز لہجہ میں بولی۔ "آپ نہ جانے کب سے بیٹھے ہیں۔ اور مجھے خبر تک نہ دی اور شاید آپ باہر ہی باہر چلے بھی جاتے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں سنی یہ کس طرح ممکن تھا۔ تمھارے پاس آہی رہا تھا کہ تم خود آگئیں۔"

لالہ مداری لال کمرہ کے باہر جاکر اپنی کار کی صفائی کا انتظام کرنے لگے۔ شاید مجھے موقع دینا چاہتے تھے کہ سُنی سے کچھ باتیں کروں۔

سُنی نے پوچھا۔ "اماں تو اچھی طرح ہیں۔"

"ہاں اچھی طرح ہیں۔ تم نے یہ کیا گت بنا رکھی ہے؟"

"میں تو بہت اچھی طرح ہوں۔"

"یہ بات کیا ہے تم لوگوں میں کیوں اَن بَن ہے۔ گویا دیوی نسکریں

جان دیئے ڈالتی ہیں۔ تم خود اپنی جان دینے کو تیار معلوم ہو رہی ہو۔ کچھ دور اندیشی سے کام لو۔

"آپ نے یہ ناگوار بحث چھیڑ دی چچا جی! میں نے تو اس خیال سے اپنے کو تسکین دے لی کہ میری تقدیر خراب ہے۔ بس اس کا علاج میرے امکان میں نہیں، میں اس زندگی سے موت کو بدرجہا بہتر سمجھتی ہوں، جہاں اپنی قدر نہ ہو، میں وفا کے بدلے وفا چاہتی ہوں، زندگی کی کوئی اور صورت میری سمجھ میں نہیں آتی، اس معاملہ میں کسی کا سمجھوتہ کرنا میرے لئے غیر ممکن ہے۔ نتیجہ کی پرواہ نہیں کرتی۔"

"لیکن ...... نہیں چچا جی، اس معاملہ میں آپ کچھ نہ کہئے ورنہ میں چلی جاؤں گی۔"

"آخر سوچو تو ۔ ۔ ۔"

"میں سب سوچ چکی اور طے کر چکی۔ حیوان کو آدمی بنانا میری قدرت سے باہر ہے۔"

اس کے بعد میرے لئے بجز خاموشی کے اور کیا رہ گیا تھا۔

(۵)

مئی کا مہینہ تھا۔ میں منصوری گیا ہوا تھا کہ گوپا کا تار پہونچا۔ فوراً آئیے، بہت ضروری کام ہے۔ میں گھبرا تو گیا۔ لیکن اتنا یقین تھا کہ کوئی سانحہ نہیں ہوا ہے، دوسرے ہی دن دہلی پہونچا۔ گوپا میرے روبرو آکر کھڑی ہو گئی، بے زبان، بحس، بے جان جیسے تپ دق کا مریض ہو۔

میں نے پوچھا "خیریت تو ہے۔ میں تو گھبرا اٹھا" اس نے بجھی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور بولی " سچ " !

" منی خیریت سے تو ہے ؟"

" ہاں اچھی طرح ہے " " اور کیدار ناتھ ؟" " وہ بھی اچھی طرح ہیں "

" تو پھر ماجرا کیا ہے " ؟ " کچھ بھی نہیں " " تم نے تار دیا اور کہتی ہو کہ کچھ بھی نہیں "

" دل گھبرا رہا تھا ۔ اس لئے تمہیں بلالیا منی کو کسی طرح سمجھا بجھا کر یہاں لانا ہے میں تو سب کچھ کر کے تھک گئی "

" کیا کوئی نئی بات ہوگئی ؟ "

" کیدار ایک ایکٹرس کے ساتھ کہیں بھاگ گیا ہے ۔ ایک ہفتہ سے ان کا کہیں پتہ نہیں ہے ۔ منی سے کہہ گیا ہے کہ جب تک تم رہو گی گھر نہ آؤں گا ۔ سارا گھر منی کا دشمن ہو رہا ہے ۔ لیکن وہ وہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لیتی ۔ سنا ہے بینک سے اپنے باپ کے دستخط بنا کر کئی ہزار روپے اڑا لے گیا ہے "

" تم منی سے مل تو آئیں ؟ تو پھر اسے زبردستی کیوں بلا رہی ہو ، وہ نہیں آنا چاہتی تو رہنے دو "

" وہاں گھٹ کر مر جائے گی "

میں انہی قدموں لالہ مداری لال کے گھر پہنچا تو دیکھا کہرام مچا ہوا ہے ۔ میرا کلیجہ دھک سے ہوگیا ۔ وہاں جنازہ تیار ہو رہا تھا ۔ محلہ کے صدہا آدمی جمع تھے ۔ گھر میں ہائے ہائے کی صدا آرہی تھی ، یہ منی کی لاش تھی ۔

مداری لال مجھے دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ گئے ۔ " بھائی صاحب ! میں تو لٹ گیا

لڑکا بھی گیا۔ بہو بھی گئی۔ افسوس!"

معلوم ہوا جب سے کیدار چلا گیا تھا۔ سُنی پہلے سے بھی زیادہ مغموم رہتی تھی۔ اُس نے اسی دن اپنی چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں اور مانگ کا سیندور پونچھ ڈالا تھا۔ ساس نے جب اسے بُرا بھلا کہا تو ان سے بھی اُلجھ گئی۔ مداری لال نے سمجھانا چاہا تو ان کو بھی جلی کٹی سُنائیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ دماغ میں فتور آگیا ہے۔ لوگوں نے اس سے کچھ کہنا چھوڑ دیا۔ آج صبح جمنا اشنان کرنے گئی اندھیرا تھا۔ سارا گھر سو رہا تھا۔ کسی کو جگایا بھی نہیں۔ جب یہاں بہو گھر میں نہ ملی تو تلاش ہونے لگی۔ بڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ جمنا گئی ہے لوگ ادھر بھاگے وہاں بہت تلاش کے بعد اسکی لاش ملی ہے۔ ابھی تھوڑے دن پہلے جو پالکی پر سوار ہو کر آئی تھی۔ آج چار کے کاندھے پر جا رہی ہے، میں میّت کے ساتھ ہو لیا اور وہاں سے لوٹا تو رات کے دس بج گئے تھے۔ لالہ مداری لال کو تشفی دے کر میں گوپا کے پاس آیا۔ میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔ معلوم نہیں گوپا کی کیا حالت ہو گی۔ اس سے زیادہ دلشکن حادثہ اس کے لئے کیا ہو سکتا۔ سُنی اس کی جان تھی، اس کا ارمان تھا، سُنی ہی اس کی حیات کا منزل مقصود تھی، اُس کے اُجڑے ہوئے گلزار میں یہی ایک پودا بچ رہا تھا۔ اسی کو وہ خونِ جگر سے سینچتی تھی۔ اس کی بہار کے سنہرے خواب ہی اس کی زندگی تھی۔ اس میں کونپلیں نکلیں گی۔ پھول کھلیں گے پھل لگیں گے۔ چڑیاں اس کی شاخوں پر بیٹھ کر میٹھے نغمے گائیں گی۔ لیکن آج اتفاق کے ظالم ہاتھوں نے اس پودے کو اُکھاڑ کر پھینک دیا۔ اور اب اس کی زندگی میں کوئی مزا نہ تھا۔ وہ مرکز ہی غائب ہو گیا تھا۔ جس پر زندگی کے سارے خطوط جمع ہوتے تھے۔

دل کو دونوں ہاتھوں سے تھامے میں نے زنجیر کھٹکھٹائی۔ گوپا نکلی۔ اس کے

ہاتھ میں ایک لالٹین تھی۔ اس کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ گوپا کے چہرے پر ایک نئی مسرت جھلک رہی تھی، میری غمناک صورت دیکھکر اس نے مادرانہ اُلفت سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی آج تو تمھیں سارا دن ہی روتے کٹا۔ جنازہ کے ساتھ بہت سے آدمی ہونگے۔ میرے جی میں بھی آیا چل کر سُنّی کا آخری دیدار کر لوں۔ لیکن میں نے سوچا کہ جب سُنّی نہ رہی تو اس کی لاش میں کیا رکھا ہے، نہ گئی "

میں حیرت سے گوپا کا منہ تکنے لگا کہ اسے اس سانحہ کی خبر مل چکی ہے پھر بھی یہ سکون اور یہ اطمینان! بولا۔" اچھا کیا نہ گئیں، رونا ہی تو تھا "

" ہاں اور کیا، روئی تو یہاں بھی۔ لیکن تم سے سچ کہتی ہوں دل سے نہیں روئی نہ جانے کیسے آنسو نکل آئے۔ مجھے تو اس کی موت سُنکر خوشی ہوئی۔ دُکھیا اپنی عزت آبرو سے دنیا سے رخصت ہوگئی۔ نہیں تو جانے کیا کیا مصیبتیں جھیلنی پڑتیں۔ اس خیال سے اور بھی خوش ہوں کہ اس نے اپنی آن نباہ دی۔ عورت کی زندگی میں پیار اور عزت نہ ملے تو اس کا ختم ہو جانا ہی اچھا۔ تم نے سُنّی کا چہرہ دیکھا تھا۔ لوگ کہتے ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مُسکرا رہی ہے۔ میری سُنّی سچ مچ دیوی تھی۔ آدمی اس لئے تھوڑا ہی جینا چاہتا ہے کہ روتا رہے۔ جب معلوم ہو گیا کہ زندگی میں دُکھ کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو آدمی جی کر کیا کرے۔ یہ میں نہیں کہتی کہ مجھے سُنّی کی یاد نہ آئے گی۔ اور میں اسے یاد کرکے روؤں گی نہیں، لیکن وہ رنج کے آنسو نہ ہوں گے۔ خوشی کے آنسو ہوں گے "

بہادر بیٹے کی ماں اس کی بہادری پر خوش ہوتی ہے۔ سُنّی نے کچھ کم بہادری کی ہے سوچو! میں آنسو بہاکر اس کی رُوح کو صدمہ پہنچاؤں! رات زیادہ ہوگئی ہے۔ جاکر اوپر سو رہو۔ میں نے تمھاری چارپائی بچھادی ہے مگر دیکھو اکیلے پڑے پڑے رونا

نہیں۔ ششی نے وہی کیا جو اُسے کرنا چاہیئے تھا۔

میں اوپر جاکر لیٹا تو میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ مگر رہ رہ کر دل میں یہ شبہ پیدا ہوتا تھا کہ گویا کا یہ سکونِ قلب ہے یا شدتِ درد؟

عصمت ۱۹۳۴ء

ریاست کا دیوان

مسٹر مہتہ ان بدنصیبوں میں تھے جو اپنے آقا کو خوش نہیں رکھ سکتے وہ دل سے اپنا کام کرتے تھے ۔ بڑی سی یکسوئی اور ذمہ داری کے ساتھ اور یہ بھول جاتے تھے کہ وہ کام کے نوکر تو ہیں ہی اپنے آقا کے نوکر بھی ہیں ۔ جب ان کے دوسرے بھائی دربار میں بیٹھے خوش گپیاں کرتے ، وہ دفتر میں بیٹھے کاغذوں سے سر مارتے اور اس کا نتیجہ تھا کہ جو آقا پرور تھے ان کی ترقیاں ہوتی تھیں ، انعام و اکرام پاتے تھے ، اور یہ حضرت جو فرض پرست تھے ۔ راندۂ درگاہ سمجھے جاتے تھے ۔ اور کسی نہ کسی الزام میں نکالدئیے جاتے تھے زندگی میں ایسے تلخ تجربے انہیں کئی بار ہوئے تھے ۔ اس لئے جب ابکی راجہ صاحب سیتا نے انہیں اپنے ہاں ایک معزز عہدہ دیدیا تو انھوں نے عہد کر لیا کہ اب میں بھی آقا کا رُخ دیکھ کر کام کروں گا اور ان کی مزاج داری کو اپنا شعار بناؤں گا ۔ لگن کے ساتھ کام کرنے کا پھل پاچکا اب ایسی غلطی نہ کروں گا ۔

دو سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ راجہ صاحب نے انھیں اپنا دیوان بنالیا ایک خود مختار ریاست کی دیوانی کا کیا کہنا ۔ تنخواہ تو بہت کم تھی مگر اختیارات

غیر محدود۔ راجہ صاحب اپنے سیر و شکار اور عیش و نشاط میں مصروف رہتے تھے ساری ذمہ داری مسٹر مہتہ پر تھی۔ ریاست کے حکام ان کے سامنے فرق نیاز خم کرتے، رئیسار نذرانے دیتے، تجار سجدے بجالاتے۔ یہاں تک کہ رانیاں بھی ان کی خوشامد کرتی تھیں۔ راجہ صاحب بد مزاج آدمی تھے اور بد زبان بھی۔ کبھی کبھی سخت سست کہہ بیٹھتے۔ مگر مسٹر مہتہ نے اپنا وطیرہ بنا لیا تھا کہ صفائی یا عذر میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالتے۔ سب کچھ سر جھکا کر سن لیتے۔ راجہ صاحب کا غصہ فرو ہو جاتا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ پولٹیکل ایجنٹ کا دورہ تھا۔ ریاست میں ان کے خیر مقدم کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ راجہ صاحب نے مسٹر مہتہ کو بلا کر کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ صاحب بہادر یہاں سے میرا کلمہ پڑھتے ہوئے جائیں۔"

مہتہ نے سر اٹھا کر کہا "کوشش تو ایسی کر رہا ہوں ان داتا۔"

"میں کوشش نہیں چاہتا جس میں ناکامی کا پہلو بھی شامل ہے یقینی وعدہ چاہتا ہوں۔"

"ایسا ہی ہو گا۔"

"روپیہ کی پرواہ مت کیجئے۔"

"جو حکم"

"کسی کی فریاد یا شکایت پر کان نہ دیجئے۔"

"جو حکم"

"ریاست کی جو چیز ہے وہ ریاست کی سب ہے۔ آپ اس کا بے دریغ استعمال کر سکتے ہیں۔"　　"جو حکم"

(۲)

ادھر تو پولیٹیکل ایجنٹ کی آمد تھی۔ ادھر مسٹر مہتہ کا لڑکا جے کرشن گرمیوں کی تعطیل میں گھر آیا۔ الہ آباد یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ ایک بار ۱۹۳۲ء میں کوئی تقریر کرنے کے جرم میں چھ مہینے جیل میں ہو آیا تھا۔ اور تب سے کسی قدر خود سر ہو گیا تھا۔ مسٹر مہتہ کے تقرر کے بعد جب وہ ریاست میں پہلی بار آیا تھا تو راجہ صاحب نے بڑی بے تکلفی سے باتیں کی تھیں اسے اپنے ساتھ شکار کھیلنے کے لئے لے گئے تھے اور روزانہ اس کے ساتھ کھیلتے تھے۔ جے کرشن راجہ صاحب کے قوم پرورانہ خیالات سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اُسے معلوم ہوا تھا کہ راجہ صاحب سچے محب وطن ہی نہیں انقلاب کے حامیوں میں ہیں روس اور فرانس کے انقلاب پر دونوں میں خوب مباحثے ہوئے لیکن اب کی یہاں اس نے کچھ اور ہی رنگ دیکھا۔ علاقہ کے ہر ایک کاشتکار اور زمیندار سے اس تقریب کے لئے جبراً چندہ وصول کیا جا رہا تھا۔ رقم کا تعین دیوان صاحب کرتے۔ وصول کرنا پولیس کا کام تھا۔ فریاد اور احتجاج کی مطلق شنوائی نہ ہوتی تھی۔ ہزاروں مزدور سرکاری عمارتوں کی صفائی اور سجاوٹ اور سڑکوں کی مرمت میں بیگار بھر رہے تھے۔ بنیوں سے رسد جمع کی جا رہی تھی۔ ساری ریاست میں واویلا مچا ہوا تھا۔ جے کرشن کو حیرت ہو رہی تھی، یہ کیا ہو رہا ہے۔ راجہ صاحب کے مزاج میں اتنا تغیر کیسے ہو گیا! کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ راجہ صاحب کو ان زبردستیوں کی خبر نہ ہو اور انھوں نے جن تیاریوں کا حکم دیا ہو اس کی تعمیل میں کارپردازوں کی جانب سے اس گرمی کا اظہار کیا جا رہا ہو۔ رات بھر تو اس نے ضبط کیا۔ دوسرے دن صبح ہی اس نے دیوان صاحب سے پوچھا۔ آپ نے راجہ صاحب کو ان زیادتیوں کی اطلاع

نہیں دی۔

مسٹر مہتہ رعایا پرور آدمی تھے انھیں خود ان بے عنوانیوں سے کوفت ہو رہی تھی مگر حالات سے مجبور تھے۔ بیکسانہ انداز سے بولے" راجہ صاحب کا یہی حکم ہے تو کیا کیا جائے۔"

"تو آپ کو ایسی حالت میں کنارہ کش ہو جانا چاہیئے تھا۔ آپ جانتے ہیں یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری آپ کے اوپر عائد ہو رہی ہے۔ رعایا آپ ہی کو مجرم سمجھتی ہے۔"

"میں مجبور ہوں، میں نے اہلکاروں سے کنایتہً بار بار کہا ہے کہ ضرورت سے زیادہ سختی نہ کی جائے لیکن ہر ایک موقعہ پر میں موجود تو نہیں رہ سکتا۔ اگر زیادہ مداخلت کروں تو شاید اہلکار میری شکایت راجہ صاحب سے کر دیں۔ اہلکار ایسے ہی موقعوں کے منتظر رہتے ہیں۔ انھیں تو عوام کے لوٹنے کا کوئی بہانہ چاہیئے جتنا سرکاری خزانہ میں داخل کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ اپنے گھر میں رکھتے ہیں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

جے کرشن کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا" تو آپ استعفےٰ کیوں نہیں دیدیتے؟"

مسٹر مہتہ ہمدردانہ لہجہ میں بولے۔" بیشک میرے لئے مناسب تو یہی تھا۔ لیکن زندگی میں اتنے دھکے کھا چکا ہوں کہ اب برداشت کی طاقت نہیں رہی۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ ملازمت کر کے میں اپنے ضمیر کو بے داغ نہیں رکھ سکتا نیک و بد اور فرض اور ایمانداری کے جھمیلوں میں پڑ کر میں نے بہت سے تلخ تجربات حاصل کئے۔ میں نے دیکھا کہ دُنیا، دنیاداروں کے لئے ہے جو موقع و محل دیکھ کر کام کرتے ہیں۔

اصول پرستوں کے لئے دنیا مناسب جگہ نہیں ہے۔"
جے کرشن نے پوچھا "میں راجہ صاحب کے پاس جاؤں؟"
مہتہ نے اس سوال کا جواب نہ دے کر پوچھا "کیا تمھارا خیال ہے کہ راجہ صاحب کو ان واقعات کا علم نہیں ہے؟"
"کم سے کم اُن پر حقیقت تو روشن ہو جائے گی۔"
"مجھے خوف ہے تمھارے منہ سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکل جائے جو مہاراج کی ناراضگی کا باعث ہو۔"
جے کرشن نے انہیں یقین دلایا کہ اسکی جانب سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہوگی مگر اسے کیا خبر تھی کہ آج کے مہاراج صاحب وہ نہیں ہیں جو ایک سال قبل تھے یا ممکن ہے پولٹیکل ایجنٹ کے رخصت ہو جانے کے بعد ہو جائیں۔ ان کے لئے آزادی اور انقلاب کی گفتگو بھی اسی طرح تفریح کے باعث تھی، جیسے قتل اور جدال کی وارداتیں یا بازارِ حسن کی دلآویز خبریں۔ اس لئے جب اس نے مہاراج کی خدمت میں اطلاع کرائی تو معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت اس وقت ناساز ہے۔ لیکن وہ لوٹ ہی رہا تھا کہ مہاراج کو خیال آیا۔ شاید اس سے فلمی دنیا کی تازہ ترین خبریں معلوم ہو جائیں۔ اُسے بُلا لیا اور مسکرا کر بولے "تم خوب آئے بھئی۔ کہو تم نے ایم سی سی کا میچ دیکھا یا نہیں؟ میں تو ان پریشانیوں میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ جا نہ سکا۔ اب تو یہی دُعا کر رہا ہوں کہ کسی طرح ایجنٹ صاحب خوش خوش رخصت ہو جائیں۔ میں نے جو تقریر تیار کروائی ہے وہ ذرا تم بھی دیکھ لو۔ میں نے ان قومی تحریکوں کی خوب خبر لی ہے۔ اور ہریجن تحریک کے بھی چھینٹے اُڑا دیئے ہیں۔

نجے کرشن نے اعتراض کیا " لیکن ہریجن تحریک سے سرکار کو بھی اتفاق ہے۔ اسی لئے اُس نے مہاتما جی کو رہا کر دیا ۔ اور جیل میں بھی انہیں اس تحریک کے متعلق لکھنے پڑھنے کی کامل آزادی دے رکھی تھی ۔

راجہ صاحب نے عاز ماً تبسم کے ساتھ کہا " تم ان رموز سے واقف نہیں ہو یہ بھی سرکار کی ایک مصلحت ہے دل میں گورنمنٹ خوب سمجھتی ہے کہ بالآخر یہ تحریک بھی قوم میں ہیجان پیدا کرے گی اور ایسی تحریکوں سے اسے فطرتاً کوئی ہمدردی نہیں ہوسکتی سرکار اس کیفیت کو بڑے غور سے دیکھ رہی ہے ۔ لائلٹی میں جتنی سرگرمی کا اظہار کر و چاہے وہ حماقت کے درجہ تک ہی کیوں نہ پہنچ جائے ۔ سرکار کبھی بُرا نہ مانے گی ۔ اسی طرح جیسے شعراء کی مبالغہ آمیز مدح سرائیاں ہماری خوشی کا باعث ہوتی ہیں چاہے ان میں تضحیک کا پہلو کیوں نہ ہو ہم ایسے شاعر کو خوشامدی سمجھیں، احمق بھی سمجھ سکتے ہیں ۔ مگر اس سے ناراض نہیں ہو سکتے وہ جتنا بھی مبالغہ کرے ۔ اتنا ہی ہمارے قریب آجاتا ہے ؟

راجہ صاحب نے اپنے خطبہ کی ایک خوبصورت کاپی میز کی دراز سے نکال کر جے کرشن کے ہاتھ میں رکھ دی ۔ مگر جے کرشن کے لئے اب اس تقریر میں کوئی دلچسپی نہ تھی اگر وہ موقعہ شناس ہوتا تو ظاہرداری کے لئے ہی اس تقریر کو بڑے غور سے دیکھتا ۔ اس کی عبارت آرائیوں کی داد دیتا ۔ اس کا موازنہ مہاراجہ صاحب بیکانیر یا پٹیالہ کی تقریروں سے کرتا ۔ مگر ابھی وہ اس کوچہ سے ناآشنا تھا ۔ جس چیز کو بُرا سمجھتا تھا اسے بُرا کہتا تھا ۔ جس چیز کو اچھا اسے اچھا ۔ بُرے کو اچھا اور اچھے کو بُرا کہنا ابھی اُسے نہ آیا تھا ۔ اس نے تقریر پر سرسری نظر ڈال کر میز پر رکھ دیا اور اپنی

آزادروی کا بگل بجاتا ہوا بولا:-

" میں ان عقدوں کو کیا سمجھوں گا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ حکام پکے نبض شناس ہوتے ہیں اور تصنع سے مطلق متاثر نہیں ہوتے۔ بلکہ اس سے انسان انکی نظروں میں اور بھی گر جاتا ہے۔ اگر پولٹیکل ایجنٹ کو معلوم ہو جائے کہ اس خیر مقدم کے لئے رعایا پکنے ستم کئے جارہے ہیں تو شاید وہ یہاں سے خوش ہو کر نہ جائیگا۔ پھر ایجنٹ کی خوشنودی آپ کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے رعایا کو اس سے اُلٹا اور نقصان ہی ہو گا"

راجہ صاحب دیگر فرمانرواؤں کی طرح اپنے سے زیادہ طاقتوروں کے سامنے تو انکسار کے پتلے تھے لیکن کمزوروں کیجانب سے نکتہ چینی کی انہیں مطلق برداشت نہ تھی انکے غصہ کی ابتدائی صورت جرح ہوتی تھی، پھر استدلال کا درجہ آتا تھا جو فوراً تردید کی صورت اختیار کرلیتا تھا اسکے بعد وہ زلزلہ کی حرکتوں میں نمودار ہوتا۔ سُرخ ترچھی آنکھوں سے بولے "کیا نقصان ہوگا ذرا سنوں؟"

جے کرشن سمجھ گیا کہ غصہ کی مشین گن گردش میں آگئی ہے سنبھل کر بولے۔

"اسے آپ مجھ سے زیادہ سمجھ سکتے ہیں"

"نہیں میں اتنا زود فہم نہیں ہوں"

"آپ بُرا مان جائیں گے"

"کیا تم سمجھتے ہو میں بارود کا ڈھیر ہوں"

"بہتر ہو اگر آپ مجھ سے یہ سوال نہ کریں"

"تمھیں بتلانا پڑیگا" اور اضطراری طور پر انکی مٹھیاں بند ہو گئیں" فوراً اسی وقت" جے کرشن پر رعب کیوں طاری ہونے لگا، بولا "آپ ابھی پولٹیکل ایجنٹ سے ڈرتے ہیں۔ جب وہ آپ کا ممنون ہو جائے گا۔ تب آپ مطلق العنان ہو جائیں گے

اور رعایا کی فریاد سننے والا کوئی نہ رہے گا۔"

راجہ صاحب شعلہ بار آنکھوں سے تاکتے ہوئے بولے "میں ایجنٹ کا غلام نہیں ہوں کہ اس سے ڈروں۔ بالکل کوئی وجہ نہیں ہے۔ میں ایجنٹ کی محض اس لئے خاطر کرتا ہوں کہ وہ شہنشاہ کا قائم مقام ہے۔ میرے اور شہنشاہ کے درمیان برادرانہ تعلقات ہیں محض آئین سلطنت کی پابندی کر رہا ہوں۔ میں ولایت جاؤں تو اسی طرح ہز میجسٹی بھی میری تواضع و تکریم کریں گے۔ میں ڈروں کیوں؟ میں اپنی ریاست کا خود مختار راجہ ہوں۔ جسے چاہوں پھانسی دے سکتا ہوں۔ میں کسی سے کیوں ڈرنے لگا۔ ڈرنا بزدلوں کا کام ہے۔ میں خدا سے بھی نہیں ڈرتا۔ ڈر کیا چیز ہے۔ یہ میں آج تک نہ جان سکا۔ میں تمھاری طرح غیر ذمہ دار کالج کا طالب علم نہیں ہوں کہ انقلاب اور آزادی کی صدا لگاتا پھروں۔ حالانکہ تم نے ان چیزوں کا محض ابھی نام سنا ہے۔ اس کے خونیں مناظر آنکھوں سے نہیں دیکھے۔ تم خوش ہو گے۔ اگر میں ایجنٹ سے نپجہ آزمائی کروں۔ میں اتنا احمق نہیں ہوں۔ میں اندھا نہیں ہوں۔ رعایا کی حالت کا مجھے تم سے کہیں زیادہ علم ہے۔ میں شادی و غم میں ان کا شریک اور ہمدرد رہا ہوں۔ ان سے جو محبت مجھے ہو سکتی ہے۔ وہ تمہیں کبھی نہیں ہو سکتی۔ تم میری رعایا کو انقلاب کے خواب دکھا کر گمراہ نہیں کر سکتے۔ تم میری ریاست میں فساد اور شورش کے بیج نہیں بو سکتے۔ تمھیں اپنی زبان پر خموشی کی مہر لگانی ہوگی۔"

آفتاب مغرب میں ڈوب رہا تھا اور اس کی کرنیں محراب کے رنگین شیشوں سے گزر کر راجہ کے چہرہ کو اور غضب ناک بنا رہی تھیں ان کے بال نیلے ہو گئے تھے آنکھیں زرد تھیں۔ چہرہ سرخ اور جسم سبز ہو گیا تھا معلوم ہوتا تھا کہ کسی دوسری دنیا

کی ہیبتناک مخلوق ہے۔ جے کرشن کی ساری انقلاب پسندی غائب ہوگئی راجہ صاحب کو اتنے طیش میں اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا مردانہ وقار اس للکار کا جواب دینے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا۔ جیسے حلم کا جواب حلم ہی ویسے ہی غصہ کا جواب غصہ ہے۔ جب وہ رُعب اور خوف اور لحاظ اور ادب کی بندشوں کو توڑ کر بدمست ہو کر باہر نکلتا ہے۔ پھر چاہے وہ اس بدمستی میں سرنگوں ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اس نے بھی راجہ صاحب کو مجروح نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"میں اپنی آنکھوں سے یہ ظلم و ستم دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتا۔"

"راجہ صاحب نے دانت پیس کر کہا" تمہیں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"ہر ذی ہوش انسان کو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق ہے۔ آپ مجھے اس سے محروم نہیں کر سکتے۔"

"میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

"میں تمہیں ابھی جیل میں بند کر سکتا ہوں۔"

"آپ کو اس کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا، میں آپ کی رعایا نہیں ہوں۔"

اسی وقت مسٹر مہتہ نے ایک وحشت کے عالم میں کمرے میں قدم رکھا اور جے کرشن کی طرف قہر کی آنکھوں سے دیکھ کر بولے۔ "کرشنا نکل جا یہاں سے۔ ناخلف، تجھے خبر ہے تو کس سے زبان درازی کر رہا ہے۔ ابھی میری نظروں سے دور ہو جا۔ احسان فراموش کہیں کا جس تھال میں کھاتا ہے اسی میں سوراخ کرتا ہے۔ دیوانہ! اگر اب زبان کھولی ہوگی تو میں تیرا خون پی جاؤں گا۔"

جے کرشن ایک لمحہ تک مہتہ کے غضبناک چہرے کو حقارت آمیز نظروں سے

دیکھتا رہا۔ اور تب فاتحانہ غرور سے اکڑتا ہوا دیوان خانہ کے باہر نکل گیا۔

راجہ صاحب نے کوچ پر لیٹ کر کہا" مفسد آدمی ہے۔ انتہا درجہ کا مفسد میں نہیں چاہتا کہ ایسا خطرناک آدمی میری ریاست میں ایک لمحہ بھی رہے تم اس سے جا کر کہدو کہ اسی وقت یہاں سے چلا جائے ورنہ اس کے حق میں اچھا نہ ہوگا میں خود سر کی گوشمالی کرنا جانتا ہوں۔ میں محض آپ کی مروت سے اتنا تحمل کر گیا۔ ورنہ اسی وقت اسکی فتنہ انگیزیوں کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ آپ کو اسی وقت فیصلہ کرنا ہوگا یہاں رہنا ہے یا نہیں۔ اگر رہنا منظور ہے تو طلوع سحر کے قبل اسے میرے قلمرو سے باہر نکل جانا چاہیئے۔ ورنہ آپ حراست میں ہوں گے۔ اور آپ کا سارا مال واسباب ضبط کر لیا جائیگا۔"

مسٹر مہتہ نے خطاوارانہ انداز سے کہا" آج ہی ارشاد کی تعمیل کروں گا۔"

راجہ صاحب نے آنکھیں نکالکر کہا" آج نہیں اسی وقت"

مہتہ نے ذلت کو نگل کر جواب دیا۔" اسی وقت نکال دوں گا دین بندہو۔"

راجہ صاحب بولے" اچھی بات ہے۔ تشریف لیجائیے اور آدھ گھنٹہ کے اندر آکر مجھے اطلاع دیجئے۔"

مسٹر مہتہ گھر چلے تو انہیں جے کرشن پر بے انتہا طیش آرہا تھا۔ احمق چلا ہے یہاں آزادی کا راگ الاپنے۔ اب بچہ کو معلوم ہوگا۔ یہ راجے کس آب و گل کے بنے ہوتے ہیں میں اس کے پیچھے دنیا میں رسوا و ذلیل نہیں ہو سکتا۔ وہ خود اپنے فعل کا خمیازہ اٹھائے یہ بے عنوانیاں مجھے بری لگتی ہیں۔ جب کسی بات کا علاج میرے امکان میں نہیں تو اسی ایک معاملہ کے پیچھے کیوں اپنی زندگی خراب کروں۔"

گھر میں قدم رکھتے ہی انھوں نے کرخت لہجہ میں پکارا" جے کرشن۔"

جے کرشن ابھی تک گھر نہ آیا تھا۔ سُجاتا نے کہا۔" وہ تو، تم سے پہلے ہی راجہ صاحب سے ملنے گیا تھا۔ تب سے کب آیا۔ بیٹھا گپ شپ کررہا ہوگا"

اسی وقت ایک سپاہی نے ایک رقعہ لا کران کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ مہتہ نے پڑھا۔۔" اس ذلت کے بعد میں اس ریاست میں ایک لمحہ بھی رہنا گوارا نہیں کر سکتا۔ میں جاتا ہوں، آپ کو اپنا عہدہ اور اعزاز اپنے ضمیر سے زیادہ عزیز ہے۔ آپ شوق سے رہیں، میں پھر اس ریاست میں قدم نہ رکھوں گا۔ اماں جی سے میرا پرنام کہئے گا"

مسٹر مہتہ نے پرزہ بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور مایوسانہ انداز سے بولے :۔

" اس لونڈے کو نہ جانے کب عقل آئیگی۔ جاکر ہمارا راجہ صاحب سے اُلجھ پڑا۔ وہ تو یہ کہو میں پہنچ گیا۔ ورنہ راجہ صاحب اسی وقت اسے حراست میں لے لیتے۔ یہ خود مختار راجے ہیں۔ انہیں کس کا خوف۔ انگریزی سرکار بھی تو انہیں کی سنتی ہے۔ مگر بہت اچھا ہوا بچہ کو سبق مل گیا۔ اب معلوم ہوگیا ہوگا۔ دنیا میں کس طرح رہنا چاہئے اور اپنے جذبات پر قابو نہ رکھنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ میں یہ تماشے بہت دیکھ چکا اور ان خرافات کے پیچھے اپنی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتا" اور اسی وقت وہ راجہ صاحب سے اس واقعہ کی اطلاع کرنے چلے۔

(۴۳)

ایک لمحہ میں ساری ریاست میں یہ خبر مشہور ہوگئی۔ جے کرشن اپنی غریب دوستی کے باعث عوام میں بہت مقبول تھا۔ لوگ بازاروں میں اور چوراستوں پر کھڑے ہو کر اس واقعہ پر رائے زنی کرنے لگے۔ ابھی وہ آدمی نہیں تھا۔ بھائی میرے، کسی دیوتا کا اوتار سمجھو اسے۔ ہمارا راجہ صاحب سے جاکر بولا۔ وہی بے گار بند کیجئے ورنہ

شہر میں آفت آجائے گی۔ راجہ صاحب کی تو اس کے سامنے زبان بند ہوگئی۔ صاحب بغلیں جھانکنے لگے۔ شیر ہے شیر اور وہ بیگار بند کر کے رہتا۔ راجہ صاحب کو بھاگنے کی راہ نہ ملتی۔ بُت سنا ہے گھگھیانے لگے تھے۔ مگر اسی بیچ میں دیوان صاحب نے جاکر اس کے دلیس نکالے کا حکم دے دیا۔ یہ حکم سنکر اس کی آنکھوں میں خون اُتر آتا لیکن باپ کی بے عزتی کیسے کرتا۔

"ایسے باپ کو تو گولی مار دینی چاہیئے۔ یہ باپ ہے یا دشمن؟"

"وہ کچھ بھی ہے، ہے تو باپ ہی"

جے کرشن کی ماں کا نام سجاتا تھا۔ بیٹے کی جلاوطنی اس کے جگر میں برچھیاں چبھو نے لگی۔ ابھی تو اس سے جی کھول کر باتیں بھی نہ کرنے پائی تھی۔ سوچا تھا اس سال بیاہ رچائیں گے۔ چُنّی مُنّی بہو گھر میں آئے گی۔ اِدھر یہ بجلی گر پڑی نہ جانے بچارہ کہاں گیا۔ رات کو کہاں رہے گا۔ اس کے پاس روپے بھی تو نہیں ہیں۔ غریب پاؤں پاؤں بھاگا چلا جاتا ہوگا۔ دل میں ایسا طوفان اُٹھا کہ گھر اور شہر چھوڑ چھاڑ کر ریاست سے نکل جائے۔ انہیں اپنا عہدہ پیارا ہے۔ لیکر رہیں، وہ اپنے لخت جگر کے ساتھ فاقے کرے گی، اسے آنکھوں سے دیکھتی رہے گی۔ لیکن نہیں وہ جاکر فریاد کرے گی۔ انھیں بھی ایشور نے بچے دئے ہیں، ماں کا درد ماں ہی سمجھ سکتی ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار مہارانی کے قدمبوس ہو چکی تھی، فوراً سواری منگوائی اور مہارانی کے پاس جا پہنچی۔

مہارانی کے تیور آج بدلے ہوئے تھے۔ مُنہ لٹکا ہوا تھا۔ راجہ صاحب کے اقلیم دل پر توان کا راج نہ تھا۔ مگر وہ ولی عہد کی ماں تھیں اور یہ غرور انھیں مہاراجہ

سے بے نیاز رکھنے کے لئے کافی تھا۔ بولیں "بہن! تمھارا لڑکا بڑا بدزبان ہے۔ ذرا بھی ادب نہیں۔ کس سے کس طرح بات چیت کرنی چاہئے۔ اس کا اُسے ذرا بھی سلیقہ نہیں۔ مہاراج نے پہلی بار ذرا اُسے منہ لگایا تو اب کی سر چڑھ گیا کہنے لگا بیگار بند کر دیجئے۔ اور ایجنٹ صاحب کے استقبال اور مہانداری کی کوئی تیاری نہ کیجئے۔ اتنی سمجھ اُسے نہیں ہے کہ اس طرح ہیکڑی جتا کر ہم کے گھنٹے گدی پر رہ سکتے ہیں۔ پھر یہ خیال بھی تو ہونا چاہئیے کہ ایجنٹ کا رتبہ کیا ہے۔ ایجنٹ بادشاہ سلامت کا قائم مقام ہے اس کی خاطر تواضع کرنا ہمارا فرض ہے۔ یہ بیگار آخر کس دن کام آئیں گے۔ اسی موقع کے لئے ریاست سے ان کو جاگیریں مقرر ہیں۔ رعایا میں ایسی بغاوت پھیلانا کوئی بھلے آدمی کا کام ہے۔ جس تھال میں کھاؤ اُسی میں سوراخ کرو! مہاراجہ صاحب نے دیوان صاحب کا لحاظ کیا، ورنہ اسی وقت اُسے حراست میں ڈال دیتے۔ وہ اب کوئی بچہ نہیں ہے خاصا جوان ہے، سب کچھ دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ سو چو حاکموں سے بیر کریں تو کے دن ہمارا نباہ ہو۔ اس کا کیا بگڑتا ہے۔ کہیں سو پچاس کی نوکری پا ہی جائیگا۔ یہاں تو ریاست تباہ ہو جائے گی۔"

سجاتا نے آنچل پھیلا کر کہا۔ "مہارانی بجا فرماتی ہیں۔ مگر اب تو اس کی خطا معاف کیجئے بچارہ شرم اور خوف سے گھر نہیں گیا۔ نہ جانے کدھر نکل گیا۔ ہماری زندگی کا یہی ایک سہارا ہے۔ مہارانی ہم دونوں رو رو کر مر جائیں گے۔ آنچل پھیلا کر آپ سے بھیک مانگتی ہوں اس کی خطا معاف کیجئے۔ ماں کے درد کو آپ سے زیادہ کون سمجھے گا۔ آپ ہی میرے رنج کا اندازہ کر سکتی ہیں۔ آپ مہاراج سے سفارش کر دیں تو......"

مہارانی نے بات کاٹ کر کہا "کیا کہتی ہو سجاتا دیوی، مہاراج سے اس کی

سفارش کروں! آستین میں سانپ پالوں۔ تم کس منہ سے مجھ سے ایسی درخواست کرتی ہو اور مہاراج مجھے کیا کہیں گے۔ میں تو ایسے لڑکے کا منہ نہ دیکھتی اور تم ایسے کپوت بیٹے کی سفارش لے کر آئی ہو۔"

"ایک بدنصیب ماں کیا مہارانی کے دربار سے مایوس ہو کر جائے گی؟"

یہ کہتے کہتے سجاتا کی آنکھیں آبگوں ہوگئیں۔ مہارانی کا غصّہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ مگر وہ مہاراج کے مزاج سے واقف تھیں۔ اس وقت وہ کوئی سفارش نہ سُنیں گے۔ اس لئے مہارانی کوئی وعدہ کر کے شرمندگی کی ذلّت نہ اُٹھانا چاہتی تھیں۔

"میں کچھ نہیں کر سکتی سجاتا دیوی"

"سفارش کا ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکال سکتیں؟"

"میں مجبور ہوں"

سجاتا آنکھوں میں غصّہ کے آنسو لا کر بولی "اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں مظلوموں کے لئے فریاد کی کوئی جگہ نہیں ہے۔"

مہارانی کو رحم دیر میں آتا تھا۔ غصّہ ناک پر رہتا تھا۔ گرم ہو کر بولیں "اگر تم نے سوچا تھا کہ میں تمہارے آنسو پونچھونگی۔ تو تم نے غلطی کی تھی۔ جو قاتل ہماری جان لینے پر آمادہ ہو اس کی سفارش لے کر آنا۔ اس کے سوا اور کیا کہنا ہے کہ تم اس جرم کو خفیف سمجھتی ہو، اگر تم نے اس کی اہمیت کا اندازہ کیا ہوتا تو ہرگز میرے پاس نہ آتیں۔ جس نے ریاست کا نمک کھایا ہے وہ ریاست کے ایک بدخواہ سے ہمدردی کرے یہ خود بہت بڑا جرم ہے۔"

سجاتا بھی گرم ہوئی۔ جذبۂ مادری مصلحت پر غالب آگئی۔ "بولی راجہ کا کام

محض اپنے حکام کو خوش کرنا نہیں ہے، رعایا پروری کی ذمہ داری بھی اُن کے سر ہے اور یہ اس کا مقدّم فرض ہے۔"

اسی وقت مہاراجہ نے کمرہ میں قدم رکھا۔ رانی نے اُٹھ کر ان کی تعظیم دی۔ اور مسز تا گھونگھٹ نکال کر سر جھکائے دم بخود کھڑی رہ گئی۔ کہیں مہاراجہ صاحب نے تو اس کی بات نہیں سُن لی۔

راجہ نے پوچھا۔ "یہ کون عورت تمہیں راجوں کے فرائض کی تعلیم دے رہی تھی؟"

رانی نے کہا "یہ دیوان صاحب کی بیوی ہیں"

راجہ نے مضحکہ اُڑاتے ہوئے کہا۔ "جب ماں ایسی زبان دراز ہے تو لڑکا کیوں نہ گستاخ اور باغی ہو۔ دیوی جی میں تم سے یہ تعلیم نہیں لینا چاہتا کہ راجہ کے اپنی رعایا کے ساتھ کیا فرائض ہیں۔ مجھے یہ تعلیم کئی پشتوں سے ملتی چلی آتی ہے۔ بہتر ہو کہ تم کسی سے یہ تعلیم حاصل کر لو کہ آقا کی جانب اس کے نمک خواروں کے کیا فرائض ہیں۔ اور جو نمک حرام ہیں اُن کے سامنے اُسے کیسا برتاؤ کرنا چاہیئے۔"

راجہ صاحب طیش کے عالم میں باہر چلے گئے۔ مسٹر مہتہ جا ہی رہے تھے کہ راجہ صاحب نے تند لہجہ میں پکارا۔ "سُنئیے مسٹر مہتہ" آپ کے صاحبزادے تو رخصت ہو گئے لیکن مجھے ابھی معلوم ہوا کہ غدّاری کے میدان میں آپ کی دیوی جی اُن سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ وہ محض ریکارڈ ہے۔ جس میں دیوی جی کی آواز بول رہی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جو شخص ریاست کی ذمہ داریوں کا مرکز ہے۔ اس کے سایہ میں ریاست کے ایسے بدخواہوں کو پناہ ملے، آپ خود اس ذمہ داری سے بری نہیں ہو سکتے۔ یہ ہرگز میری بے انصافی نہ ہو گی اگر میں خیال کروں کہ آپ

کی چشم پوشی نے ہی یہ حالات پیدا کئے ہیں۔ میں یہ خیال کرنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ نے صریحاً نہیں تو کنایتہً ضرور ان خیالات کی تحریک کی ہے "

مسٹر مہتہ اپنی ذمہ داری اور آقا پروری پر یہ حملہ برداشت نہ کر سکے فوراً مردانہ تردید کی۔" یہ تو میں کس زبان سے کہوں کہ اس معاملہ میں حضور بے انصافی کر رہے ہیں لیکن میں بے قصور ہوں، اور مجھے یہ دیکھ کر ملال ہوتا ہے کہ میری وفاداری پر یوں شبہ کیا جائے "

مہاراج نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔" اسکے لئے ثبوت کی ضرورت ہے دیوان صاحب!"

کیا ابھی ثبوت کی ضرورت باقی ہے؟ میرا خیال ہے میں ثبوت دے چکا "

" نہیں نئے انکشافات کے لئے نئے ثبوت کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ اپنی دیوی جی کو ہمیشہ کے لئے ریاست سے رخصت کر دیں۔ میں اس میں کسی طرح کا عذر نہیں سننا چاہتا "

" لیکن مہاراج ...."

" میں ایک حرف نہیں سننا چاہتا "

" میں کچھ عرض نہیں کر سکتا "

" ایک لفظ بھی نہیں "

مسٹر مہتہ یہاں سے چلے تو انہیں سجانا پر بیحد غصہ آ رہا تھا۔ ان سب کے دماغ میں نہ جانے کیوں یہ خبط سما گیا ہے۔ جے کرشن تو خیر لڑکا ہے ناآزمودہ کار اس بڑھیا کو کیا حماقت سوجھی۔ نہ جانے رانی سے کیا کیا کہہ آئی۔ میرے ہی گھر میں کسی کو مجھ سے ہمدردی نہیں۔ سب اپنی اپنی دھن میں مست ہیں۔ کس مصیبت سے میں اپنی

زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں۔ یہ کوئی نہیں سوچتا۔ کتنی پریشانیوں اور ناکامیوں کے بعد ذرا اطمینان سے سانس لینے پایا تھا کہ ان سب لے یہ نئی مصیبت کھڑی کر دی حق اور انصاف کا ٹھیکہ کیا ہم نے لے لیا ہے۔ یہاں بھی وہی ہو رہا ہے۔ جو ساری دُنیا میں غریب اور کمزور ہونا جرم ہے۔ اس کی سزا سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ باز کبوتر پر کبھی رحم نہیں کرتا۔ حق اور انصاف کی حمایت انسان کی شرافت کا ایک جزو ہے۔ بیشک اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن جس طرح اور سب لوگ صرف زبان سے اس کی حمایت کرتے ہیں، کیا اسی طرح ہم بھی نہیں کر سکتے۔ اور جن لوگوں کی حمایت کی جائے ان کی نگاہ میں کچھ اس حمایت کی قدر بھی تو ہو۔ آج راجہ صاحب انہیں مظلوم مزدوروں سے ذرا ہنس کر باتیں کر لیں تو یہ لوگ ساری شکایتیں بھول جائیں اور ہماری ہی گردن کشی پر آمادہ ہو جائیں گے۔ سجاتا کی بھویں چڑھی ہوئی تھیں ضرور اس نے مہارانی صاحب سے بدزبانی کی ہوگی۔ خوب اپنے دل کا غبار نکالا ہوگا۔ یہ نہ سمجھیں کہ دنیا میں کس طرح عزت اور آبرو کے ساتھ بیٹھا جائے۔ اس کے سوا ہیں اور کیا چاہیئے۔ اگر تقدیر میں نیک نامی لکھی ہوتی، تو اس طرح دوسروں کی غلامی کیوں کرتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سجاتا کو بھیجوں کہاں؟ میکے میں کوئی نہیں سب میرے گھر میں کوئی نہیں۔ اونہہ! اب میں اس کی کہاں تک فکر کروں، جہاں جی چاہے جائے۔

وہ اس غم و غصہ کی حالت میں گھر میں داخل ہوئے۔ سجاتا ابھی ابھی آئی تھی کہ مہتہ نے جھنجکر دل شکن انداز سے کہا "آخر تمھیں بھی وہی حماقت سوجھی جو اس لونڈے کو سوجھی تھی۔ میں کہتا ہوں آخر تم لوگوں کو کبھی عقل آئے گی یا نہیں، کیا ساری دُنیا

از منشی پریم چند

کی اصلاح کا بیڑا ہمیں نے اٹھایا ہے؟ کون راجہ ہے جو اپنی رعا
ان کے حقوق نہ پامال کرتا ہو۔ راجہ ہی کیوں؟ ہم تم دوسروں کے حقو
درازی کر رہے ہیں۔ تمہیں کیا حق ہے کہ تم درجنوں خدمتگار رکھو، اور انھیں ر
سے قصور پر سزائیں دو۔ حق اور انصاف مہمل الفاظ ہیں جن کا مصرف اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ چند عقلمندوں کو شہادت کا درجہ ملے اور بہت سے احمقوں کو ذلت و رسوائی کا۔ تم مجھے اپنے ساتھ ڈبائے دیتی ہو۔ حالانکہ میں تم سے بارہا کہہ چکا ہوں کہ میں اپنی زندگی میں مہاراجہ سے پرخاش نہ کروں گا۔ حق کی حمایت کر کے دیکھ لیا پشیمانی اور بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ میں صاف کہتا ہوں کہ میں تمہاری حماقتوں کا خمیازہ اُٹھانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

سجاتا نے خودداری کی شان سے کہا۔ "میں یہاں سے چلی جاؤں یہی تو تمہارا منشا ہے؟ میں بڑی خوشی سے جانے کو تیار ہوں؛ میں ایسے ظالم کی عملداری میں پانی پینا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔"

"اس کے سوا مجھے اور کوئی صورت نہیں نظر آتی۔ میں پوشیدہ طور پر تمہارے اخراجات کے لئے روپے بھیجتا رہوں گا۔"

"نہیں مجھے تمہارے روپیوں کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنے روپے جمع کرنا اور بینک کا اکاؤنٹ دیکھ دیکھ کر خوش ہونا۔ کون جانے کہیں راز فاش ہو جائے تو آقائے نامدار کا قہر تمہارے اوپر نازل ہو جائے۔ میرا لڑکا اور کچھ نہ کر سکے گا تو شام تک نمک روٹی لے ہی آئے گا۔ میں اسی میں خوش رہوں گی۔ میں بھی دیکھوں گی کہ تمہاری آقا پروری کب تک نبھتی ہے۔ اور تم کہاں تک اپنے

کا خون کرتے ہو "

مہتہ نے ہاتھ مل کر کہا۔ " تم کیا چاہتی ہو کہ پھر اسی طرح چاروں طرف ٹھوکریں کھاتا پھروں ؟ "

سجاتا نے طنز کے ساتھ کہا " ہرگز نہیں۔ ابتک میرا خیال تھا کہ عہدے اور روپے سے عزیز تر بھی تمھارے پاس کوئی چیز ہے۔ جس کے لئے تم ٹھوکریں کھانا اچھا سمجھتے ہو۔ اب معلوم ہوا تمھیں عہدہ اور مروت اپنے ضمیر سے بھی زیادہ عزیز ہے پھر کیوں ٹھوکریں کھاؤ۔ کبھی کبھی اپنی خیریت کا خط بھیجتے رہنا۔ یا اس کے لئے بھی راجہ صاحب کی اجازت لینی پڑے گی "

مہتہ نے آقا پروری کے جوش کے ساتھ کہا۔ " راجہ صاحب اتنے ظالم نہیں ہیں کہ میرے جائز حق میں دست اندازی کریں "

" اچھا راجہ صاحب میں اتنی انسانیت ہے۔ مجھے تو اعتبار نہیں آتا۔

" تم نے کہاں جانے کا ارادہ کیا ہے "

" جہنم میں ! "

(۴)

جس وقت سجاتا گھر سے رخصت ہونے لگی تو میاں بیوی دونوں خوب روئے اور ایک طرح سے سجاتا نے اپنی غلطی تسلیم کرلی۔ کہ واقعی اس بیکاری کے زمانہ میں مہتہ کا یہی طرز عمل مناسب تھا۔ سچ مچ بچارے کہاں کہاں مارے پھریں۔

اسی طرح شوہر سے علیٰحدہ ہونے سے اسے روحانی صدمہ ہورہا تھا اور

اگر مہتہ نے جھوٹوں اصرار کیا ہوتا تو وہ گھر سے باہر پاؤں نہ نکالتی۔ مگر ادھر راجہ صاحب پَل پُل پر دریافت کر رہے تھے کہ دیوی جی گئیں یا نہیں اور اب قدم پیچھے ہٹانے کے لئے کوئی بہانہ نہ تھا۔

پولٹیکل ایجنٹ صاحب تشریف لائے خوب دعوتیں کھائیں۔ خوب شکار کھیلے اور خوب سیریں کیں۔ مہاراجہ صاحب نے ان کی تعریف کی انھوں نے مہاراجہ صاحب کی تعریف کی اور ان کے انصاف اور رعایا پروری اور تنظیم کی خوب دل کھول کر داد دی۔ مسٹر مہتہ کی کارگذاری نے بھی تحسین کا خراج وصول کیا۔ ایسا وفاشعار اور کارگذار افسر اس ریاست میں کبھی نہ آیا تھا۔ ایجنٹ صاحب نے ایک گھڑی انہیں انعام دی۔

اب راجہ صاحب کو کم سے کم تین سال کے لئے فراغت تھی ایجنٹ ان سے خوش تھا۔ اب کس بات کا غم اور کس کا خوف۔ عیاشی کا دَور دورہ انہاک کے ساتھ شروع ہوا نت نئے حسینوں کی بہم رسانی کے لئے خفیہ خبر رسانی کا ایک محکمہ قائم ہوگیا اور اُسے زنانہ تعلیم کا نام دیا گیا۔ نئی نئی چڑیاں آنے لگیں، کہیں تخویف کام کرتی تھی - کہیں تحریص، کہیں تالیف، لیکن ایسا موقع بھی آیا۔ جب اس تثلیث کی ساری انفرادی اور اجتماعی کوششیں ناکام ہوئیں اور خفیہ محکمہ نے فیصلہ کیا کہ اس نازنین کو اس کے گھر سے بہ جبر اُٹھالایا جائے اور اس خدمت کے لئے مہتہ صاحب کا انتخاب ہوا۔ جس سے زیادہ جاں نثار خادم ریاست میں دوسرا نہ تھا۔ ان کی جانب سے مہاراجہ صاحب کو کامل اطمینان تھا۔ کمتر درجہ کے اہلکار ممکن ہے رشوت لے کر شکار چھوڑ دیں یا افشا راز کر بیٹھیں یا امانت میں خیانت مہتہ کی جانب سے کسی قسم

کی بے عنوانی کا اندیشہ نہ تھا۔ رات کو نو بجے چوبدار نے ان کو اطلاع دی "اَن داتا نے یاد کیا ہے۔"

مہتہ صاحب جب ڈیوڑھی پر پہونچے تو راجہ صاحب باغیچے میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ مہتہ کو دیکھتے ہی بولے آئیے۔ مسٹر مہتہ! آپ سے ایک اہم معاملہ میں مشورہ لینا ہے۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ آپ کا مجسمہ اسی باغ کے وسط میں نصب کیا جائے۔ جس سے آپ کی یادگار ہمیشہ قائم رہے۔ آپ کو تو غالباً اس میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

مہتہ نے بڑے انکسار کے ساتھ کہا" یہ اَن داتا کی غلام نوازی ہے میں تو ایک ذرہ ناچیز ہوں۔"

"میں نے لوگوں سے کہدیا ہے کہ اس کے لئے فنڈ جمع کریں۔ ایجنٹ صاحب نے اب کی جو خط لکھا ہے اس میں آپ کو خاص طور سے لکھا ہے۔"

"یہ اُن کی غریب پروری ہے۔ میں تو ادنیٰ خادم ہوں۔"

راجہ صاحب ایک لمحہ تک سگار پیتے رہے۔ تب اس انداز سے بولے گویا کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔ "تحصیل خاص میں ایک موضع جگن پور ہے آپ وہاں کبھی گئے ہیں؟"

مہتہ نے مستعدی سے جواب دیا" ہاں اَن داتا ایک بار گیا ہوں، وہاں ایک متموّل ساہوکار ہے، اسی کے دیوان خانہ میں ٹھہرا تھا۔ معقول آدمی ہے۔"

"ہاں ظاہر میں بہت اچھا آدمی ہے مگر دل کا نہایت خبیث۔ آپ کو معلوم ہے۔ مہارانی صاحبہ کی صحت بہت خراب ہوتی جاتی ہے۔ اور اب میرے

لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ اپنی دوسری شادی کرلوں۔ راجاؤں کا یہ عام وطیرہ ہے کہ کسی نہ کسی حیلہ سے روز نئی نئی شادیاں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے اس ہوس پروری سے ہمیشہ احتراز کیا ہے اور ابتک بڑی تندہی سے رانی صاحبہ کا علاج کرتا رہا۔ لیکن ان کی حالت روز بروز گرتی جاتی ہے اور اب میں مجبور ہو گیا ہوں۔ ایک لڑکی بھی تجویز کرلی ہے جو ہر اعتبار سے رانی بننے کے قابل ہے۔ اسی ساہوکار کی لڑکی ہے۔ میں ایک بار اُدھر سے گذر رہا تھا تو میں نے اسے کھڑکی سے جھانکتے دیکھا۔ مجھے معاً خیال آیا کہ اگر یہ حسینہ رنواس میں آجائے تو میری عمر دراز ہو جائے۔ میں نے خاندان کے آدمیوں سے اس بارے میں صلاح کی اور اس ساہوکار کے پاس پیغام بھیجدیا۔ مگر اسے مفسدوں نے کچھ ایسی پٹی پڑھائی ہے کہ وہ کسی طرح راضی نہیں ہوتا۔ کہتا ہے کہ لڑکی کی شادی ہو چکی ہے۔ مجھے جہاں تک معلوم ہوا ہے یہ اس کی بہانہ بازی ہے۔ لیکن بالفرض اس کی شادی بھی ہو چکی ہو تو راجہ کی حیثیت سے میرا حق فائق ہے اور پھر میں ہر قسم کا تاوان برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن وہ مفسد برابر انکار کئے جاتا ہے۔ مجھے اس لڑکی کا ہر وقت خیال رہتا ہے۔ مجھے ایسا اندیشہ ہو رہا ہے کہ اگر ناکام رہا تو شاید جانبر نہ ہو سکوں۔ اندیشہ ہی نہیں۔ یہ اس قسم کا یقینی امر ہے آپ کو بھی شاید اس قسم کا کبھی تجربہ ہوا ہو۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ خواب حرام ہے، ہمیشہ اسی کی یاد میں محو رہتا ہوں۔ اور ایسی حالت میں مجھے آپ کے سوا کوئی دوسرا ایسا آدمی نظر نہیں آتا۔ جو اس مسئلہ کو حل کر سکے، آپ جانتے ہیں۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ تھوڑے سے معتبر آدمیوں کو

لے کر جائیں اور اس حسینہ کو راضی کر کے لائیں۔ خوشی سے آئے خوشی سے جیر سے آئے جبر سے، اس کی پرواہ نہیں، میں ریاست کا مالک ہوں۔ اس میں جس چیز پر میری نظر ہو اس پر کسی دوسرے شخص کا کوئی قانونی یا اخلاقی حق نہیں ہو سکتا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ میری زندگی آپ کے ہاتھ میں ہے، اور آپ کی خوش تدبیری سے میری جان بچ گئی، تو آپ ہمیشہ ریاست کے محسنوں میں شمار کئے جائیں گے۔ اور ...."

مسٹر مہتہ کے مدت سے منجمد خون میں یکایک اُبال آیا۔ بولے "آپ کا منشا ہے میں اُسے کڈنیپ کر لاؤں؟"

راجہ صاحب نے اُن کے تیور دیکھ کر تبسم کے ساتھ کہا "ہرگز نہیں، میں تو آپ کو اپنا معتمد سفیر بنا کر بھیجتا ہوں۔ حصول مقصد کے لئے آپ کو ہر ممکن تدبیر سے کام لینے کا اختیار ہے۔"

مسٹر مہتہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "مجھ سے یہ کمینہ فعل نہیں ہو سکتا۔"

"کسی حسینہ سے شادی کی درخواست کمینہ فعل ہے؟"

"جبری اغوا بے شک کمینہ فعل ہے۔"

"آپ اپنے ہوش میں ہیں؟"

"خوب اچھی طرح"

"میں آپ کو خاک میں ملا سکتا ہوں۔"

"اگر آپ مجھے خاک میں ملا سکتے ہیں تو میں بھی آپ کو خاک میں ملا سکتا ہوں۔"

"میری نیکیوں کا یہی صلہ ہے نمک حرام ......"

"آپ اب احترام کی حد سے آگے بڑھے جاتے ہیں۔ راجہ صاحب، میں نے اب تک ضمیر کا خون کیا ہے۔ اور آپ کے ہر ایک جا اور بیجا حکم کی تعمیل کی ہے لیکن ضمیر فروشی کی بھی حد ہوتی ہے۔ جس کے آگے کوئی بھی ذی ہوش آدمی نہیں جا سکتا۔ آپ کا فعل ایک راجہ کے شایانِ شان نہیں۔ اور اس میں جو شخص اعانت کرے وہ گردن زدنی ہے۔ میں ایسے فعل پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ گھر آئے۔ اور راتوں رات سامانِ سفر درست کر کے ریاست سے نکل گئے۔ مگر اس سے قبل اس معاملہ کا کچا چٹھا ایجنٹ کے نام بھیج دیا۔

عصمت ۱۹۲۴ء

وفا کا دیوتا

(۱)

منشی ہوری لال کی بیوی کا جب انتقال ہوا، وہ ایک طرح دُنیا سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ یوں روزانہ کچہری جاتے ہیں۔ اب بھی ان کی وکالت بُری نہیں ہے۔ بیلہ دوستوں سے مراسم بھی رکھتے ہیں۔ میلوں تماشوں میں بھی جاتے ہیں۔ مگر اس لئے نہیں کہ ان مشاغل سے انہیں کوئی خاص دلچسپی ہے، بلکہ اس لئے کہ وہ انسان ہیں، اور انسان ایک مجلسی حیوان ہے۔ جب ان کی بیوی بقید حیات تھی اس وقت کچھ اور ہی عالم تھا۔ کسی نہ کسی بہانے سے آئے دن احباب کی دعوتیں ہوتی رہتی تھیں۔ کبھی گارڈن پارٹی ہے، کبھی جنم اشٹمی ہے۔ کبھی ہولی۔ مہمان نوازی میں گویا اُن کو مزہ آتا تھا۔ آپ سے محض رسمی ملاقات ہے۔ لیکن اُن کے گھر چلے جائیے تو چائے اور پھلوں سے آپ کی خاطر کئے بغیر نہ رہیں گے۔ دوستوں کی مدد کے لئے ہمیشہ تیار اور انتہا درجہ زندہ دل۔ اُن کے قہقہے گراموفون میں بھرنے کے قابل ہوتے تھے۔ اولاد سے محروم تھے۔ لیکن کسی نے انہیں ملول نہیں دیکھا۔ محلّے کے سارے بچّے

اُن کے بچے تھے۔ اور بیوی بھی بالکل ہم مزاج آپ کتنے ہی دل گرفتہ ہوں اس دیوی سے ملاقات ہوتے ہی آپ کے خون میں ایک تازہ روانی آ جائے گی۔ خدا جانے اتنے لطیفے اور ضرب المثل کہاں سے یاد کر لئے تھے۔ بات بات پر کہاوتیں کہتی تھی اور جب کسی کو بنانے پر آجاتی تھی تو رلا کر چھوڑتی تھی۔ خانہ داری میں تو اس کا ثانی نہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے عاشق تھے۔ اُن کی محبت کی تازگی میں زمانہ کے اثرات سے کوئی فرق نہ آتا تھا۔ کچہری سے چھٹی پاتے ہی وہ شخص دیوانوں کی طرح بھاگتا تھا۔ آپ کتنا ہی اصرار کریں مگر اس وقت ایک منٹ کے لئے بھی راستے میں نہ رُکتا تھا۔ اور اگر کبھی منشی جی کے آنے میں دیر ہو جاتی تھی تو وہ جاں نثار بیوی پیچھے پر کھڑی اُن کی راہ دیکھتی رہتی تھی۔ بیس سال تک یہی کیفیت رہی۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ ان کی محبت روز بروز زیادہ جاذب اور لطیف ہوتی جاتی تھی۔ دونوں کی طبیعتیں اس قدر مل گئی تھیں کہ جو بات ایک کے دل میں آتی وہی دوسرے کے دل میں منعکس ہو جاتی تھی۔ یہ نہیں کہ اُن میں اختلاف نہ ہوتا تھا۔ بہت سے مسائل میں اُن کے خیالات مختلف تھے۔ اور اپنے دعوے کی تائید اور دوسرے کے دعوے کی تردید میں اُن میں خوب مباحثے ہوتے تھے۔ کوئی باہر کا آدمی سُنے تو سمجھے کہ دونوں لڑ رہے ہیں۔ اور اب معاملہ میدانِ عمل میں آنے والا ہے مگر ان کے مباحثے دماغ سے ہوتے تھے۔ دل دونوں کے ایک تھے۔ دونوں سیر چشم، دونوں خندہ رُو، صاف گو، بے لوث، غیبت یا عیب جوئی سے کوسوں بھاگنے والے گویا عالم علوی کے باشی ہوں، چنانچہ بیوی کا انتقال ہوا تو کئی مہینے لوگوں کو اندیشہ رہا کہ کہیں یہ حضرت خودکشی نہ کر بیٹھیں۔ ہم لوگ ہمیشہ ان کی دلجوئی کرتے رہتے۔ کہیں انہیں تنہا نہ بیٹھنے دیتے۔

رات کو بھی کوئی نہ کوئی ان کے ساتھ رہتا تھا۔ دیوانوں کا غم کھانے والے دوسرے نکل ہی آتے ہیں۔ احباب کی بیویاں تو اُن پر جان دیتی تھیں۔ اُن کی نظروں میں تو وہ فرشتوں سے بھی بڑھ کر تھے۔ ان کی مثال دے دے کر اپنے شوہروں سے کہتیں اسے کہتے ہیں محبت، ایسا مرد ہو تب عورت اس کی کیوں نہ غلامی کرے۔ جب سے بیوی مری ہے۔ غریب نے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ کبھی نیند بھر نہیں سویا۔ ایک تم ہو دل میں کہتے ہوگے، مر جائے تو دوسری شادی رچائیں، دل میں خوش ہوں گے کہ اچھا ہوا مر گئی۔ روگ ٹلا۔ اب نئی بیوی لائیں گے۔

اور اس وقت منشی جی کا پینتالیسواں سال تھا قویٰ مضبوط۔ صحت اچھی، خوشرو، خوش مزاج، باحیثیت چاہتے تو دوسری شادی کر لیتے، اُن کے ہاں کرنے کی دیر تھی۔ غرض مند لڑکی والوں نے سلسلہ جنبانیاں کیں اور دوستوں نے بھی اُجڑا گھر بسانا چاہا۔ مگر اس دلدادۂ وفا نے محبت کے نام کو داغ نہ لگایا۔ اس کی ساری تمنائیں اور ساری خواہشیں فنا ہو گئیں۔ اب ہفتوں خط نہیں بنتا۔ بال بڑھے ہوئے ہیں۔ کچھ پرواہ نہیں، کہاں تو منہ اندھیرے اُٹھتے تھے اور چار میل کا چکر لگا آتے تھے۔ کبھی الکسا جاتے تو دیوی جی گھر کیاں جماتیں اور انہیں باہر نکال کر دروازہ بند کر لیتیں، کہاں اب آٹھ بجے تک چارپائی پر کروٹیں بدل رہے ہیں۔ اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا، خدمت گار نے حقہ لا کر رکھ دیا۔ دو چار کش لگا لئے نہ لائے تو غم نہیں۔ چائے آئی پی لی۔ نہ آئے تو پرواہ نہیں۔ دوستوں نے بہت اصرار کیا تو سنیما دیکھنے چلے گئے۔ لیکن کیا دیکھا کیا سنا خبر نہیں کہاں تو اچھے اچھے سوٹوں کا خبط تھا۔ کوئی خوشنما ڈیزائن کا کپڑا بازار میں

آجائے۔ منشی جی ایک سوٹ بنوائیں گے۔ اُن کے لئے اُن کی بیری ہی بنوائے گی۔ کہاں اب وہ وہی پُرانے دُھرانے، پُرشکن، بدرنگ، کپڑے جسم پر لٹکائے چلے جارہے ہیں۔ جواب لاغری کے باعث اتارے کے لگتے ہیں، اور جنہیں اب کسی طرح سوٹ نہیں کہا جاسکتا۔ مہینوں بازار جانے کی نوبت نہیں آتی۔ اب کی کڑاکے کا جاڑا پڑا تو آپ نے ایک روئی دار نیچا لبادہ کوٹ بنوالیا جسے پہن کر بالکل بھگت جی بن گئے۔ صرف کنٹوپ کی کسر تھی۔ بیوی ہوتی تو یہ لبادہ چھین کر کسی فقیر کو دیدتی۔ مگر اب کون دیکھنے والا ہے کسے پرواہ ہے کہ وہ کیا پہنتے ہیں اور کیسے رہتے ہیں۔ پینتالیس کی عمر میں جو شخص پینتیس کا جچتا تھا وہ اب پچاس کی عمر میں ستر کا معلوم ہوتا ہے کمر میں کچھ خم بھی آگیا ہے، بال سفید ہوگئے ہیں۔ دانت بھی غائب ہوگئے جس نے تب دیکھا ہو وہ آج پہچان بھی نہ سکے۔

مزا یہ کہ اس وقت جن مسئلوں پر لڑا کرتے تھے وہی اب اُن کے جزو ایمان بنا گئے ہیں۔ معلوم نہیں اُن کے خیالات میں انقلاب ہو گیا ہے یا مرحومہ نے اُن کی رُوح میں محلول ہو کر اختلافات کا خاتمہ کر دیا ہے۔ بیوی بدھوا لواہ کو سخت ناپسند کرتی تھی، میاں اس کے پکے مؤید تھے۔ لیکن اب وہ بدھوا لواہ کو معیوب سمجھتے ہیں پہلے نئی تہذیب کے شیدائی تھے۔ اب اس تہذیب کا اُن سے بہتر نکتہ چیں مشکل سے ملے گا۔ ایک بار یونہی انگریزوں کی پابندیٔ اوقات کا ذکر آگیا۔ میں نے کہا اس معاملہ میں ہیں انگریزوں سے سبق لینا چاہیئے۔ بس آپ اُٹھ بیٹھے اور والہانہ انداز سے بولے "ہرگز نہیں، قیامت تک نہیں۔ میں اس پابندی کو خود غرضی کا قطب، رعونت کا ہمالیہ، اور کج خلقی کا صحرا سمجھتا ہوں۔ ایک شخص مصیبت

کا مارا آپ کے پاس آتا ہے معلوم نہیں کونسی ضرورت اُسے آپ کے پاس کھینچ لائی ہو لیکن آپ فرماتے ہیں میرے پاس وقت نہیں یہ طرزِ عمل انہی لوگوں کا ہے جو وقت کو روپیہ سمجھتے ہیں اور اپنا ایک ایک منٹ کسب زر کی نذر کرنا چاہتے ہیں ۔ جو شخص انسانیت کا دلدادہ ہے ۔ وہ کبھی اس طرزِ عمل کو پسند نہیں کر سکتا ۔ ہم اپنا دروازہ ہر وقت کھلا رکھنا چاہتے ہیں ۔ جسے جب ضرورت ہو ، ہمارے پاس آئے ہم پوری توجہ سے اس کا حال سنیں گے اور اس کے غم یا مسرت میں شریک ہوں گے اچھی تہذیب ہے ! یہ تہذیب ہے یا بدتہذیبی جس تہذیب کی اسپرٹ خود غرضی پر مبنی ہو وہ دنیا کے لئے لعنت ہے عذاب ہے ، اسی طرح مذہب کے معاملہ میں بھی میاں بیوی میں کافی ردو کد ہوتی رہتی تھی ۔ مرحومہ ہندو دھرم کو سب سے بڑھکر سمجھتی تھی ۔ آپ اسلام کے اصولوں کے قائل تھے ، مگر اب آپ بھی پکے ہندو ہیں ۔ بلکہ یوں کہیئے کہ لامذہب ہو گئے ہیں ۔ ایک دن بولے میری کسوٹی تو ہے انسانیت جس دھرم میں انسانیت کو فضیلت دی گئی ہے ، بس اُسی دھرم کو میں افضل سمجھتا ہوں کوئی دیوتا ہو ، یا منی ، یا پیغمبر ، اگر وہ انسانیت کے خلاف اصولوں کی تلقین کرتا ہے ، تو میرا اُسے دُور سے سلام ہے ۔ اسلام کا میں اس لئے قائل تھا کہ وہ اخوت اور مساوات کا علمبردار ہے ، لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ اخوت اور مساوات عالمگیر نہیں صرف مذہب کے دائرے تک محدود ہے ۔ دوسرے لفظوں میں دیگر مذاہب کی طرح یہ بھی محض غول بندی ہے ۔ اس کے آئین و قوانین محض غول کے استحکام و انضباط کے لئے بنائے گئے ہیں ۔ گائے یا اونٹ کی قربانی کرنا عین ثواب ہے ، آج بھی کہیں کہیں اس فرقے کے نام لیوا موجود ہیں ۔ تو کیا گورنمنٹ نے انسانی

قربانی کو جرم نہیں قرار دیا۔ اور ایسے مذہبی دیوانوں کو پھانسی نہیں دی۔ نفس کے لئے آپ بھیڑ کو ذبح کیجئے یا گائے کو یا اونٹ کو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن مذہب کے نام پر قربانی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر آج جانوروں کے ہاتھ میں حکومت آجائے تو فرمائیے۔ وہ ان قربانیوں کے جواب میں ہمیں اور آپ کو قربان کر دیں یا نہیں۔ مگر ہم جانتے ہیں، جانوروں کو کبھی وہ قدرت حاصل نہ ہوگی۔ اسی لئے ہم بے غل و غش قربانیاں کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں، ہم بڑے مذہب پرور ہیں۔ خود غرضی اور ہوس پرستی کے لئے ہم چوبیسوں گھنٹوں مذہبی شریعت کی خلاف ورزی کرتے ہیں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن قربانی کا ثواب لوٹے بغیر ہم سے نہیں رہا جاتا۔ تو جناب ایسے خون آشام مذاہب کا قائل نہیں، یہاں تو انسانیت کے پجاری ہیں۔ چاہے اسلام میں ہو یا ہندو دھرم میں یا عیسائیت میں ورنہ میں لامذہب ہی بھلا۔ مجھے کسی انسان سے اس لئے بغض یا نفرت نہیں ہے کہ وہ میرا ہم مشرب نہیں ہے کسی کا خون تو نہیں بہاتا۔ اس لئے کہ مجھے ثواب ہوگا۔"

اسی طرح کتنے ہی انقلابات منشی جی کے خیالات میں آگئے ہیں۔ اور اُن کے پاس گفتگو کا ایک ہی موضوع ہے۔ جس سے وہ کبھی نہیں تھکتے اور یہ ہے اس جنّت نصیب کا ذکر خیر۔ کوئی مہمان آجائے آپ باؤلے سے ادھر اُدھر دوڑ رہے ہیں کچھ نہیں سوجھتا۔ کیسے اس کی خاطر کریں معذرت کے لئے الفاظ ڈھونڈھتے پھرتے ہیں۔ بھائی جان میں آپ کی کیا خاطر کروں۔ جو آپ کی سچی خاطر کرتا وہ نہیں رہا۔ اس وقت تک آپ ناشتے کے انتظار میں نہ رہتے۔ منہ اندھیرے چائے اور ٹوسٹ حاضر ہو جاتا۔ اس وقت بادام کا حلوا اور سنترے اور سیب آملتے۔ تو میں نرا احمق ہوں

بھائی صاحب۔ مجھ میں جو کچھ اچھا تھا۔ وہ سب اُس کا فیض تھا۔ اُسی کی ذہانت سے میں ذہین تھا۔ اُسی کی فیاضی سے فیاض اُسی کی شرافت سے شریف۔ اب تو لاشئہ بے جان ہوں۔ بھائی صاحب بالکل مُردہ ہوں۔ میں اُس دیوی کے لائق نہ تھا۔ نہ جانے کن اعمالِ نیک کے صلے میں وہ مجھے ملی تھی۔ آئیے آپ کو اس کی تصویر دکھاؤں۔ معلوم ہوتا ہے ابھی ابھی اُٹھ کر چلی گئی ہے۔ بھائی جان آپ سے حلفاً کہتا ہوں۔ میں نے ایسی ماہرو نہیں دیکھی۔ اس کے چہرے پر حُسن کا رُعب ہی نہ تھا حُسن کی لطافت بھی تھی اور دلکشی بھی۔

آپ مشتاق نظروں سے وہ تصویر دیکھتے ہیں۔ آپ کو اس میں حُسن کی کوئی خاص دلکشی نہیں نظر آتی۔ فربہ جسم ہے۔ چوڑا سا منہ۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں انداز میں دہقانیت نمایاں ہے۔ مگر اس تصویر کے محاسن آپ کے سامنے کچھ اس شدومد اور انہماک کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں کہ آپ کو سچ مچ اس تصویر میں حُسن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس وقتِ خیر میں جتنا وقت گزرتا ہے، وہی منشی جی کی زندگی کے بہترین لمحے ہیں۔ اتنی ہی دیر وہ زندہ رہتے ہیں۔ باقی اوقات میں زندہ درگور۔

پہلے کچھ دنوں تک تو وہ ہمارے ساتھ صبح کو ہوا خوری کے لئے جاتے رہے وہ کیا جاتے رہے میں زبردستی اُنہیں لے جاتا تھا۔ لیکن روز آدھ گھنٹے تک اُن کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ کسی طرح گھر سے نکلتے بھی تو چیونٹی سی چال سے چلتے اور آدھ میل میں ہی ہمت ہار جاتے۔ لوٹ چلنے کا تقاضہ کرنے لگتے۔ آخر میں نے اُنھیں ساتھ لے جانا چھوڑ دیا۔ اور تب سے بس ان کی چہل قدمی چالیس قدم کی رہ گئی ہے۔ سیر گیا ہے، بیگار رہے، اور وہ بھی اس لئے کہ مرحومہ کے سامنے ان کا یہ

معمول تھا۔

ایک دن حسبِ معمول اُن کے دروازے سے نکلا تو دیکھا کہ اوپر کی کھڑکیاں جو برسوں سے بندھی پڑی تھیں کھلی ہوئی ہیں۔ تعجب ہوا۔ دروازے پر خدمت گار بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ اس سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ حضرت گھومنے گئے ہوئے ہیں مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ آج نئی بات کیوں؟ اتنے سویرے تو یہ کبھی نہیں اُٹھتے جس طرف وہ گئے تھے ادھر میں نے بھی قدم بڑھائے۔ اور ایک ہفتہ سے مجھے ادھر آنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ ایک قرابت داری میں گیا تھا۔ اس دوران میں کیا انقلاب ہو گیا۔ ضرور کوئی نہ کوئی راز ہے، دریافت حال کے لئے دل بیقرار ہو گیا۔ کوئی دو میل جا کر آپ ملے۔ جب میں مایوس ہو کر لوٹنے والا تھا تعجب ہو رہا تھا کہ راستے میں کہاں رہ گئے۔ راستے میں کسی سے ملاقات ہی نہیں ہے جہاں ٹھہر گئے ہوں۔ کچھ تشویش ہو رہی تھی۔ حضرت کہیں کسی کوئیں میں تو نہیں کود پڑے دُور سے انہیں آتا دیکھ کر دل کو اطمینان ہوا۔ آج تو کینڈا ہی اور تھا۔ بال سنئے فیشن سے تراشے ہوئے مونچھیں صاف داڑھی چکنی چہرے پر بشاشت، رفتار میں پھرتی، سوٹ پرانا مگر برش کیا ہوا تھا۔ اور شاید استری بھی کی ہو۔ بوٹ پر پالش مسکراتے چلے آتے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور بولے

"آج کئی دن بعد نظر آئے۔ کہیں گئے تھے کیا؟"

میں نے اپنی غیر حاضری کا سبب بتا کر کہا "میں ڈرتا ہوں آج تمہیں کہیں نظر نہ لگ جائے۔ چشم بد دُور۔ اب میں روزانہ تمہارے ساتھ گھومنے آیا کروں گا۔ آج بہت دنوں بعد تم نے آدمی کا چولا بدلا ہے۔"

جھینپ کر بولے" نہیں بھئی۔ مجھے اکیلا ہی رہنے دو۔ تم لگو گے دوڑانے اور اِدھر گھرکیاں جماؤ گے۔ میں اپنے ہولے ہولے چلا جاتا ہوں۔ جب تھک جاتا ہوں کہیں بیٹھ جاتا ہوں "

" تمہاری یہ وضع تو ایک ہفتہ پہلے تک تھی۔ آج تو تم بالکل اپ ٹوڈیٹ ہو۔ اس رفتار سے تو شاید میں تم سے پیچھے ہی رہوں گا۔

" تم تو بنانے لگے "

" میں کل سے آؤں گا اور تمہارے ساتھ سیر کروں گا۔ میرا انتظار کرنا "

نہیں بھئی مجھے دق مت کرو۔ میں آج کل بہت سویرے اُٹھ جاتا ہوں۔ رات کو نیند نہیں آتی۔ سوچتا ہوں لاؤ ٹہل ہی آؤں۔ تم میرے ساتھ کیوں پریشان ہو گئے "

میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ حضرت ہمیشہ میرے پیروں پڑتے تھے کہ مجھے بھی ساتھ لے لیا کرو۔ جب میں نے ان کی سست روی سے مجبور ہو کر تنہا ٹہلنا شروع کیا۔ تو ان کی بہت دل شکنی ہوئی۔ دو ایک بار مجھ سے شکایت بھی کی " ہاں بھئی اب کیوں ساتھ دو گے؟ بدنصیبوں کا ساتھ کسی نے دیا ہے یا تم کوئی نئی تہذیب نکالو گے۔ زمانہ کا دستور ہے جو لنگڑا ہوتا ہے اُسے دھکیل دو۔ جو بیمار ہو اُسے زہر دے دو۔ یہی نئے زمانہ کی روش ہے " لیکن میں نے اُن کے طعن و طنز کی پروا نہ کی تھی۔ اور وہی شخص آج مجھ سے پیچھا چھڑا رہا ہے۔ یہ کیا راز ہے۔ یہ چُستی اور تیزی اور بشاشت کہاں سے آ گئی۔ کہیں حضرت نے بندر کی گلٹی تو نہیں لگوائی۔ ضرور یہی بات ہے؟ یہ نیا سول سرجن

غدود کے فن میں ماہر ہے۔ ممکن ہے۔ انہیں کسی نے سوجھایا ہو۔ اور حضرت نے ہزار پانچ سو روپیہ خرچ کرکے گلٹی بدلوائی ہو۔ اس معمہ کو حل کئے بغیر مجھے چین کہاں۔ ان کے ساتھ ہی لوٹ پڑا۔

• نرم چلنے کے بعد میں نے پوچھا" سچ کہنا برادر گلٹی ولٹی تو نہیں لگوائی"

انہوں نے استفسار کی نظروں سے دیکھا" کیسی گلٹی میں نہیں سمجھا"

" مجھے شک ہو رہا ہے کہ تم نے بندر کے غدود لگوائے ہیں۔ ورنہ تم میں یہ جانداری کہاں سے آگئی ؟"

" ارے یار کیوں کوستے ہو۔ بندر کے غدود کس لئے لگواتا۔ میرے تو ذہن میں یہ بات کبھی آئی ہی نہیں"

" تو کیا کوئی برقی آلہ منگوالیا ہے ؟"

" تم آج میرے پیچھے کیوں ہاتھ دھو کر پڑے۔ بیوہ عورت بھی تو کبھی سنگار کرلیتی ہے۔ انسان کی طبیعت ہی تو ہے۔ ایک دن مجھے اپنی پست ہمتی اور کاہلی پر افسوس ہوا۔ جب دنیا میں رہنا ہے تو زندوں کی طرح کیوں نہ رہوں۔ مردوں کی طرح جینے سے کیا فائدہ۔ بس اور کوئی بات نہیں ہے"

مجھے تاویل سے تشفی نہ ہوئی۔ دوسرے دن ذرا سویرے آیا۔ اور منشی جی کے دروازے پر آواز دی۔ معلوم ہوا چلے گئے۔ میں ان کے پیچھے بھاگا۔ ضد تھی کہ اسے اکیلا نہ جانے دوں گا۔ دیکھوں کب تک مجھ سے بھاگتا ہے۔ آدھی رات کو آکر بستر سے نہ اٹھاؤں تو سہی دوڑ نہ سکا۔ لیکن جس قدر تیز چل سکتا تھا چلا۔ بارے ایک میل کے بعد آپ نظر آئے۔ بھاگے چلے جارہے تھے ۔ اب میں بار بار

پکار رہا ہوں کہ حضرت ذرا ٹھہرئیے۔ خدا کے لئے ٹھہر جائیے۔ میری سانس پھول رہی ہے۔ مگر آپ ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ آخر جب میں نے اپنے سر کی قسم دلائی۔ تب جاکر آپ رکے۔ میں لپک کر آپ کے پاس پہنچا تو چیں بہ جبیں ہوکر فرماتے ہیں "میں نے تو تم سے کہہ دیا تھا کہ میرے گھر مت آنا۔ پھر کیوں میرے پیچھے پڑ گئے۔ مجھے دھیرے دھیرے گھومنے دو۔ اب تم اپنا راستہ لو۔"

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور بولا "دیکھو ہوری لال مجھ سے اڑو نہیں، ورنہ مجھے جانتے ہو کتنا بے مروت آدمی ہوں۔ تم یہ دھیرے دھیرے ٹہل رہے ہو۔ یا ڈبل مارچ کر رہے ہو۔ میرے درد ہونے لگا۔ اور پسلیاں دکھ رہی ہیں۔ سانس پھول گئی۔ اور آپ فرماتے ہیں کہ مجھے دھیرے دھیرے گھومنے دو۔ ڈاک کا ہرکارہ بھی تو اس رفتار سے نہیں دوڑتا۔ اس پر غضب یہ کہ تم تھکتے نہیں ہو۔ اب بھی اسی دم خم سے چلے جا رہے ہو۔ اب تو تم ڈنڈے سے بھگاؤ تو بھی تمہارا دامن نہ چھوڑوں گا۔ تمہارے ساتھ دو میل چلوں گا تو بھی خاصی ورزش ہو جائے گی۔ مگر اب صاف صاف بتلاؤ راز کیا ہے۔ تم میں یہ جوانی کہاں سے آگئی؟ اگر کسی اکسیر کا استعمال کر رہے ہو۔ تو مجھے بھی دو۔ کم سے کم پتہ بتا دو۔ میں منگوالوں گا۔ اگر کسی دعا تعویذ کی کرامات ہے تو مجھے بھی اس کے پاس لے چلو۔"

مسکرا کر بولے "تم تو پاگل ہو۔ خواہ مخواہ مجھے دق کر رہے ہو۔ بوڑھے ہو گئے مگر لڑکپن نہ گیا۔ کیا تم چاہتے ہو۔ میں ہمیشہ اسی طرح زندہ درگور رہوں۔ اتنا بھی تم سے نہیں دیکھا جاتا۔ تب تو تمہارے مزاج ہی نہ ملتے تھے۔ کتنی منت کی کہ بھائی جان! مجھ خستہ جان کو بھی ساتھ لے لیا کرو۔ تمہارے طفیل میں کچھ ہوا خوری ہو جا

گی۔ مگر آپ نخرے دکھانے لگے۔ اب کیوں میرے پیچھے پڑے ہو۔ بھائی جان جو انہی مدد آپ کرتا ہے۔ اس کی مدد پرماتما بھی کرتے ہیں۔ احباب و اعزا کی مروت بھی خوب دیکھ لی۔ اب اپنے بوتے پر سیوں گا۔"

وہ اسی طرح مجھے صلواتیں سناتے جا رہے تھے اور میں انہیں چھیڑ چھیڑ کر اور بھی اشتعال دے رہا تھا کہ دفعتاً انھوں نے انگلی لب پر رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، اور ذرا قد اور سیدھا کر کے اور چہرہ پر بشاشت اور خودداری کا رنگ بھر کر مستانہ چال چلنے لگے۔ میری سمجھ میں بالکل نہ آیا اور یہ رازداری اور بہروپ کس لئے، وہاں تو کوئی دوسرا تھا بھی نہیں۔ مگر ہاں سامنے سے ایک عورت ضرور چلی آرہی تھی مگر اس کے سامنے اس پردہ دری کی کیا ضرورت۔ میں نے تو اسے کبھی دیکھا نہ تھا۔ آسمانی رنگ کی ساری جس پر زرد لیس ٹنکا ہوا تھا۔ اس پر خوب کھل رہی تھی حسین ہرگز نہ تھی مگر حسن سے زیادہ دلکش اس کی شگفتگی تھی۔ اور بھولا پن۔ انداز میں خودداری اور متانت، لباس میں حسن مذاق۔ بشرہ سے شرافت اور وجاہت عیاں ایک بہت ہی معمولی شکل و صورت کی عورت اتنی جاذب نظر ہو سکتی ہے یہ میں نہ سمجھتا تھا۔

اس نے ہوری لال کے برابر آکر دونوں ہاتھوں سے نمسکار کیا۔ ہوری لال نے کسی قدر بے اعتنائی سے سر کو جنبش دی اور آگے بڑھنا چاہتے تھے کہ اس نے کوئل کی سی آواز میں کہا۔ "لوٹئے گا نہیں۔ آپ اپنی حد سے آگے بڑھتے جا رہے ہیں اور ہاں آج تو آپ نے مجھے دیوی جی کی تصویر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ شاید آپ بھول گئے کہئے تو آپ کے ساتھ چلوں۔"

منشی جی پر ایسی عصبیت طاری تھی کہ معمولی اخلاق کا اظہار بھی نہ کر سکے۔ بولے،

وہ بہت ہی مہذب آدمی ہیں۔ اور آداب مجلس کے بڑے ماہر۔ لیکن اس وقت جیسے ان کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ ایک قدم اور آگے بڑھ کر بولے" معاف کیجئے گا۔ ذرا مجھے ایک ضرورت ہے"

عورت نے کسی قدر شکستہ خاطر ہو کر کہا۔" تو مجھے وہ تصویر کب دیجئے گا۔ آپ تو آج جیسے بھاگے جا رہے ہیں"

منشی جی نے میری طرف قہر کی نظروں سے دیکھا اور بولے" تلاش کروں گا"

عورت نے چشم فریاد سے دیکھ کر کہا" آپ نے تو فرمایا تھا کہ وہ ہمیشہ آپ کی میز پر رہتی ہے۔ اسوقت آپ کہتے ہیں تلاش کروں گا۔ آپ کی طبیعت تو اچھی ہے؟ جب سے آپ نے ان کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ میں ان کے درشنوں کے لئے بیقرار ہوں۔ اور اگر آپ یوں نہ دیں گے تو میں اُسے آپ کی میز پر سے اُٹھا لونگی (میری طرف دیکھ کر) آپ میری مدد کیجئے گا جناب، حالانکہ میں جانتی ہوں کہ آپ منشی جی کے دوست ہیں۔ اور ان کے ساتھ دغا نہ کریں گے۔ آپ کو تعجب ہو رہا ہوگا کہ یہ کون عورت منشی جی سے اتنی بے تکلفی سے باتیں کر رہی ہے۔ ان سے میری ملاقات بازار میں ہوئی۔ میں سبزمنڈی گئی ہوئی تھی۔ میں اپنی سبزی خود لاتی ہوں۔ نوکروں پر اتنا اہم کام چھوڑنا نہیں چاہتی جس پر زندگی کا قیام ہے۔ سبزی لے کر دام دینے کے لئے روپیہ نکالا تو کنجڑے نے اُسے ٹھنکا کر کہا دوسرا روپیہ دو۔ یہ خراب ہے۔ اب جو میں نے خود ٹھنکایا تو معلوم ہوا واقعی روپیہ کی آواز میں کچھ ثقالت تھی۔ اب کیا کروں۔ میرے پاس دوسرا روپیہ نہ تھا۔ حالانکہ اس طرح کے تلخ تجربے مجھے بارہا ہو چکے ہیں۔ مگر گھر سے روپیہ لے کر چلتے وقت مجھے ٹھوک بجا لینے کی یاد نہیں رہتی۔ نہ کسی سے

روپیہ لیٹے وقت ہی پرکھتی ہوں اسوقت میرے صندوق میں زیادہ نہیں تو بیس پچیس کھوٹے روپے پڑے ہوں گے - اور ریزگاریاں تو سینکڑوں ہونگی. میرے لئے اسکے سوا دوسرا چارہ نہ تھا کہ سبزی واپس کرکے گھر لوٹ آؤں. اتفاق سے منشی جی بھی اُسی دکان پر سبزی خریدنے آئے تھے. اس طرح آپ سے میرا تعارف ہوا......"

منشی جی نے بات کاٹ کر کہا" تو اس وقت آپ وہ سارا قصہ کیوں بیان کر رہی ہیں. ہم دونوں ضروری کام سے جا رہے ہیں. خواہ مخواہ دیر ہو رہی ہے"
اُنھوں نے میرا ہاتھ پکڑکر اپنی طرف کھینچا.

مجھے ان کی کج خلقی حد درجہ ناگوار گذری - کچھ اس کا راز بھی سمجھ میں آگیا مجھ سے پردہ کیا جا رہا ہے بولا" تو آپ جائیے. مجھے کوئی ایسا ضروری کام نہیں ہے میں بھی اب لوٹنا چاہتا ہوں"

منشی جی نے دانت پیس لئے اگر وہ عورت اس وقت وہاں نہ ہوتی تو معلوم نہیں میری کیا دُرگت کرتے. ایک سکنڈ تک میری طرف غضبناک نظروں سے دیکھتے رہے. گویا کہہ رہے ہوں " اچھا بچہ اس کا انتقام نہ لیا ہو تو کہنا - اور چل دیئے. میں عورت کے ساتھ گھر کی طرف چلا.

یکایک اُس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا" مگر نہیں آپ جائیے میں اُن کے ساتھ گھوموں گی. شاید وہ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں. آج ایک ہفتہ سے میرا اور ان کا روز سامنا ہوتا ہے. وہ اپنا قصہ غم سنایا کرتے ہیں. کیسی خوش نصیب تھی وہ عورت جس کا شوہر آج بھی اس کے نام کی پرستش کرتا ہے. آپ نے تو نہیں دیکھا ہوگا. کیا وہ سچ مچ بڑی جاں نثار عورت تھی"

میں نے پُر جوش لہجہ میں کہا" دونوں میں بہت محبت تھی ۔"

" اور جب سے اُن کا انتقال ہوا یہ تارک الدنیا ہو گئے ۔"

" اس سے بھی زیادہ ۔ زندگی میں بجز اس کی یاد کے انہیں اور کوئی دلچسپی نہیں رہی ۔"

" بہت حسین تھی ؟"

" ان کی نظروں میں تو اس سے زیادہ حسین عورت دنیا میں نہ تھی ۔"

اُس نے ایک منٹ تک خیال میں محو رہنے کے بعد کہا ۔" اچھا ! آپ جائیں میں جا کر اُن کے ساتھ کچھ دیر واک کر دنگی ۔ ایسے وفا پرور انسان کی مجھ سے جو خدمت ہو سکتی ہے ۔ اُس میں کیوں دریغ کروں ۔ مجھے تو اُن کی سرگذشت نے پاگل بنا دیا ہے ۔"

میں اپنا سا مُنہ لے کر گھر چلا آیا ۔ اتفاق سے اُسی دن مجھے ایک ضروری کام سے دہلی جانا پڑا ۔ وہاں سے ایک ماہ میں لوٹا ۔ اور سب سے پہلا کام جو میں نے کیا وہ منشی ہوری لال کی پرسش حال تھی پر معاملات نے اس دوران میں کیا رنگت اختیار کی ۔ یہ جاننے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا ۔ دہلی سے انہیں خط لکھا تھا ۔ مگر اس شخص کی یہ خبیث عادت ہے کہ خطوں کا جواب نہیں دیتا ۔ اس عورت سے اُن کے تعلقات نے کیا صورت اختیار کی ۔ آمدورفت جاری ہے یا قطع ہو گئی ۔ اس نے ہوری لال کی وفا پروری کا صلہ کس صورت میں ادا کیا یا کرنے والی ہے ۔ اسی طرح کے کتنے ہی سوالات دل میں ہیجان پیدا کر رہے تھے ۔ میں منشی جی کے مکان پر پہنچا ۔ تو آٹھ بجے ہوں گے ۔ کھڑکیوں کے دروازے بند تھے ۔ سامنے برآمدے

میں بھی خس و خاشاک کے انبار تھے۔ بعینہ وہی حالت تھی۔ جو اس چند روزہ انہماک سے پہلے نظر آتی تھی۔ انتشار اور بڑھا اور پر گیا تو دیکھا کہ آپ اسی فرش پہ پڑے ہوئے۔ جو بے ترتیبی اور بدسلیقگی کا نمونہ ہے۔ ایک اخبار پڑھ رہے ہیں۔ شاید ایک ہفتہ سے خط نہیں بنا تھا۔ چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "آپ سیر کر کے لوٹ آئے کیا؟"

نیم شرمندگی سے جواب دیا۔ "ابھی سیر سپاٹے کی کہاں فرصت ہے بھئی۔ اور فرصت بھی ہو تو وہ دل کہاں ہے۔ تم تو کہیں باہر گئے تھے"

"ہاں ذرا دہلی تک گیا تھا۔ کیا اب اس دیوی سے آپ کی ملاقات نہیں ہوتی"

"ادھر تو عرصہ سے ملاقات نہیں ہوئی"

"کہاں چلی گئی؟"

"مجھے کیا خبر"

"مگر آپ تو اس پر بُری طرح ریجھے ہوئے تھے"

"میں اس پہ ریجھا تھا۔ آپ کو جنون تو نہیں ہو گیا ہے۔ جس پہ ریجھا تھا جب اُسی نے رفاقت کا حق ادا نہ کیا تو اب دوسروں پر کیا ریجھوں گا"

"دیکھو ہوری لال مجھے چکمہ نہ دو۔ پہلے میں تمہیں ضرور زاہد سمجھتا تھا۔ لیکن تمہاری رنگین مزاجیاں دیکھ کر جس کا دورہ تمہارے اوپر ایک ماہ قبل ہوا تھا میں یہ نہیں مان سکتا کہ تم نے اپنی آرزوؤں کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا۔ تمہیں اس دوران کی ساری روداد مجھ سے بے کم و کاست بیان کرنی ہو گی۔ ورنہ سمجھ لو میری اور تمہاری دوستی کا خاتمہ ہے"

ہوری لال کی آنکھیں آبگوں ہوگئیں۔ چند سکنڈ بعد بولے میرے ساتھ اتنی بے انصافی نہ کرو بھائی اگر تمہیں میرے اوپر شبہ کرنے لگوگے تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ اس کا نام مس اندرا ہے۔ یہاں جو لڑکیوں کا ہائی اسکول ہے اسی کی ہیڈ مسٹرس ہوکر آئی ہے۔ میری اُن سے کیونکر ملاقات ہوئی یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ اُس کی ہمدردی نے مجھے اُس کا مداح بنا دیا۔ اس عمر میں اور اس غم کا بوجھ سر پر رکھے ہوئے مجھے اُن کی جانب جس چیز نے کھینچا وہ ان کی ہمدردی تھی۔ میں صرف اپنا قصۂ غم سنانے کے لئے روز اُن کے پاس جایا کرتا تھا۔ وہ حسین ہے۔ خوش مزاج ہے درد مند ہے۔ سلیقہ شعار ہے۔ لیکن تمہاری فرشتہ خصلت بھابی کی کچھ اور ہی بات تھی، اس نے مجھ پر جو رنگ جما دیا اُس پر اب دوسرا رنگ کیا جمے گا۔ میں اسی کی حرارت سے زندہ تھا۔ برادر۔ اس حرارت کے ساتھ زندگی بھی ختم ہوگئی۔ اب تو میں اس روضے کا مجاور ہوں۔ جو میرے دل میں ہے۔ کسی ہمدرد کی صورت دیکھتا ہوں تو دل کو خوشی ہوتی ہے۔ اور اپنا قصۂ غم سنانے لگتا ہوں۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ یہ میری کمزوری ہے، اور تم اور دیگر احباب اسی وجہ سے مجھ سے پرہیز کرتے ہیں۔ لیکن کیا کروں بھیّا۔ بغیر اپنا قصۂ غم کسی کو سنائے مجھ سے نہیں رہا جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ میرا دم گھٹ جائیگا۔

"اس لئے جب مس اندرا میری جانب ملتفت ہوئیں تو میں نے اسے امداد غیب سمجھا اور اس دُھن میں جسے میرے بہت سے احباب میری بدقسمتی سے جنون سمجھتے ہیں وہ سب کچھ کہہ گیا۔ جو میرے دل میں تھا۔ اور ہے۔ میں تو اب بھی اسی دنیا اور زمانہ میں بستا ہوں۔ مس اندرا کو نہ معلوم کیا مجھ پر رحم آگیا۔ کہاں دل کی اُلفوں

نے میری دعوت کی اور کتنی ہی لذیذ چیزیں اپنے ہاتھوں سے بنا کر کھلائیں۔ دوسرے دن خود آئیں اور یہاں کی ساری چیزیں ترتیب سے سجا گئیں۔ تیسرے دن کچھ کپڑے لائیں اور میرے لئے خود ایک سوٹ تیار کیا۔ ان کی ہمدردیاں اسی طرح روز بروز وسیع ہوتی گئیں آخر ایک دن شام کو کوئینس پارک میں انھوں نے مجھ سے کہا "آپ اپنی شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

میں نے ہنس کر کہا۔ "اس عمر میں اب کیا شادی کروں گا۔ اندرا دنیا کیا کہے گی"

مس اندرا بولی۔ "آپ کی عمر ابھی ایسی کیا زیادہ ہے۔ آپ چالیس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتے"

میں نے تصحیح کی "میرا پچاسواں سال ہے"

"عمر کا حساب سالوں سے نہیں ہوتا، صحت سے ہوتا ہے۔ آپ کی صحت کچھ توجہ کی محتاج ہے۔ کوئی آپ کو پان کی طرح پھیرنے والا چاہئے۔ آپ کی یہ افسردہ دلی دور ہو سکتی ہے"

میرا دل دھڑکنے لگا۔ گویا ختنا بج ہو گیا ہو۔ میں نے دیکھا مس اندرا کے چہرے پہ ہلکی سی سرخی دوڑ گئی ہے۔ ان کی آنکھیں شرم سے جھک گئی ہیں اور کوئی بات بار بار ان کے لبوں تک آکر لوٹ جاتی ہے۔

آخر انھوں نے میری طرف نظریں اٹھا کر کہا "اگر آپ سمجھتے ہوں کہ میں آپ کی کچھ خدمت کر سکتی ہوں تو میں ہر طرح حاضر ہوں"

میں نے معذرت آمیز لہجہ میں جواب دیا کہ میں تمھاری اس ہمدردی کا کہاں تک شکریہ ادا کروں، مس اندرا! مگر مجھے افسوس ہے کہ میں زندہ نہیں مردہ یاد کیا کروں گا۔

مجسمہ ہوں۔"

اس کے بعد میں نے ان کی محبّت اور رحم دلی اور فیاضی کی خوب دل کھول کر داد دی۔ مگر وہ میری گفتگو سے کچھ ایسی متاثر ہوئیں کہ اسی وقت یہاں سے چلی گئیں اور پھر تب سے نظر نہ آئیں۔ نہ مجھے ہی ہمت پڑی کہ ان کی تلاش کرتا۔ حالانکہ چلتے وقت انھوں نے کہا تھا۔ جب کبھی آپ کو کوئی تکلیف ہو اور آپ میری ضرورت سمجھیں، تو مجھے بلا لیجئے گا۔"

ہوری لال نے اپنی سرگزشت ختم کر کے مجھے داد خواہانہ انداز سے دیکھا۔

میں نے اس کا جواب ملامت سے دیا بولا۔ "کتنے بدنصیب ہو تم، ہوری لال مجھے تمہارے اوپر رحم بھی آتا ہے اور غصہ بھی۔ کمبخت تیری زندگی سنور جاتی، تو نے زرین موقع ہاتھ سے کھو دیا۔ یہ عورت نہیں۔ ایشور کی بھیجی ہوئی کوئی دیوی تھی۔ جو تیری اندھیری زندگی کو دوبارہ روشن کرنے کے لئے آئی تھی۔ جی چاہتا ہے تمھیں اوپر سے دھکیل دوں۔ نامعقول۔"

ہوری لال نے اپنی بیوی کی تصویر کی طرف دیکھا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولے:-

"میں تو اسی کا ہوں بھائی جان اور اسی کا رہوں گا۔"

عصمت سالگرہ نمبر ۱۹۳۵ء

دو بہنیں[1]

دو بہنیں دو سال کے بعد ایک تیسرے عزیز کے گھر ملیں ۔ اور خوب رو دھو کر خاموش ہوئیں تو بڑی بہن روپ کماری نے دیکھا کہ چھوٹی بہن رام دُلاری سر سے پاؤں تک گہنوں سے لدی ہوئی ہے ۔ کچھ اس کا رنگ کھل گیا ہے ۔ مزاج میں کچھ تمکنت آگئی ہے ۔ اور بات چیت کرنے میں کچھ زیادہ مشاق ہوگئی ہے ۔ بیش قیمت ساری اور بیلدار عنابی مخمل کے جمپر نے اس کے حسن کو اور بھی چمکا دیا ہے وہی رام دلاری جو لڑکپن میں سر کے بال کھولے پھوہڑ سی اِدھر اُدھر کھیلا کرتی تھی ۔ آخری بار روپ کماری نے اسے اس کی شادی میں دیکھا تھا ۔ دو سال قبل تب بھی اس کی شکل وصورت میں کچھ زیادہ تغیر نہ ہوا تھا ۔ لمبی تو ہوگئی تھی ۔ مگر تھی اتنی ہی دبلی اتنی ہی زرد رو ۔ اتنی ہی بدتمیز ۔ ذرا ذرا سی بات پر روٹھنے والی ، مگر آج تو کچھ حالت ہی اور تھی ، جیسے کلی کھل گئی ہو ۔ اور حسن اس نے کہاں چھپا رکھا تھا نہیں نظروں کو دھوکا ہو رہا ہے ۔ یہ حسن نہیں محض دیدہ زیبی ہے ۔ ریشم اور مخمل اور سونے کی بدولت نقشہ تھوڑا ہی بدل جائے گا ۔ پھر بھی وہ آنکھوں میں سمائی جاتی ہے ۔ پچاسوں عورتیں جمع ہیں مگر یہ سحر یہ کشش اور کسی میں نہیں ۔

---

[1] منشی جی آنجہانی کا یہ آخری افسانہ ہے ۱۲

اور اس کے دل میں حسد کا ایک شعلہ سا دھک اُٹھا۔

کہیں آئینہ ملتا تو وہ ذرا اپنی صورت بھی دیکھتی۔ گھر سے چلتے وقت اُس نے اپنی صورت دیکھی تھی۔ اُسے سے چمکانے کے لئے جتنا صیقل کر سکتی تھی یہ کیا تھا لیکن اب وہ صورت جیسے یادداشت سے مٹ گئی ہے۔ اس کی محض ایک دھندلی سی پرچھائیں ذہن میں ہے۔ اُسے پھر سے دیکھنے کے لئے وہ بیقرار ہو رہی ہے۔ یوں تو اس کے پاس میک اپ کے لوازمات کے ساتھ آئینہ بھی ہے۔ لیکن مجمع میں وہ آئینہ دیکھنے یا بناؤ سنگار کرنے کی عادی نہیں ہے۔ یہ عورتیں دل میں خدا جانے کیا سمجھیں۔ یہاں کوئی آئینہ تو ہوگا ہی۔

ڈرائنگ روم میں تو ضرور ہوگا وہ اُٹھ کر ڈرائنگ روم میں گئی۔ اور قد آدم شیشہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اس کے خدوخال بے عیب ہیں۔ مگر وہ تازگی، وہ شگفتگی وہ نظر فریبی نہیں ہے۔ ہاں نہیں ہے۔ رام دُلاری آج کھلی ہے، اسے کھلے زمانہ ہو گیا۔ لیکن اس خیال سے اُسے تسکین نہیں ہوئی۔ وہ رام دُلاری سے ہیٹی بن کر نہیں رہ سکتی۔ یہ مرد بھی کتنے احمق ہوتے ہیں۔ کسی میں اصلی حُسن کی پرکھ نہیں۔ انہیں تو جوانی اور شوخی اور نفاست چاہیئے۔ آنکھیں رکھ کر بھی اندھے بنتے ہیں۔ میرے کپڑوں میں رام دُلاری کو کھڑا کر دو۔ پھر دیکھو یہ سارا جادو کہاں اُڑ جاتا ہے۔ چڑیل سی نظر آئے۔ ان احمقوں کو کون سمجھائے۔

رام دُلاری کے گھر والے تو اتنے خوش حال نہ تھے۔ شادی میں جو جوڑے اور زیور آئے تھے وہ بہت ہی دلشکن تھے۔ عمارت کا کوئی دوسرا سامان ہی نہ تھا اس کے سسر ایک ریاست کے مختار عام تھے۔ اور شوہر کالج میں پڑھتا تھا۔

اس دو سال میں کیسے ہُن برس گیا۔ کون جانے زیور کسی سے مانگ لائی ہو؟ کپڑے بھی دو چار دن کے لئے مانگ لئے ہوں۔ اسے یہ سوانگ مُبارک رہے۔ میں جیسی ہوں ویسی ہی اچھی ہوں۔ اپنی حیثیت کو بڑھاکر دکھانے کا مرض کتنا بڑھتا جاتا ہے۔ گھر میں روٹیوں کا ٹھکانا نہیں ہے۔ لیکن اس طرح بن ٹھن کر نکلیں گی۔ گویا کہیں کی راجکماری ہیں۔ بساطیوں کے اور درزی کے اور بزاز کے تقاضے سہیں گی۔ شوہر کی گھُڑکیاں کھائیں گی۔ روئیں گی روٹھیں گی۔ مگر نمائش کے جنون کو نہیں روک سکتیں۔ گھر والے بھی سوچتے ہوں گے۔ کتنی چھچھوری طبعیت ہے۔ اس کی۔ مگر یہاں تو بیحیائی پر کمر باندھی کوئی کتنا ہی ہنسے بیحیا کی بلا دُور۔ بس یہی دُھن سوار ہے کہ جدھر سے نکل جائیں اُدھر اس کی خوب تعریفیں کی جائیں۔ رام دلاری نے ضرور کسی سے زیور اور کپڑے مانگ لئے ہیں، بے شرم جو ہے،

اس کے چہرے پر غرور کی سرخی جھلک پڑی۔

نہ سہی اس کے پاس زیور اور کپڑے۔ کسی کے سامنے شرمندہ تو نہیں ہونا پڑتا۔ ایک ایک لاکھ کے تو اس کے دو لڑکے ہیں۔ بھگوان انہیں زندہ اور سلامت رکھے۔ وہ اسی میں خوش ہے خود اچھا پہننے اور کھا لینے سے ہی تو زندگی کا مقصد پورا نہیں ہو جاتا۔ اس کے گھر والے غریب ہیں پر عزت تو ہے۔ کسی کا گلا تو نہیں دباتے۔ کسی کی بد دُعا تو نہیں لیتے۔

اس طرح اپنا دل مضبوط کرکے وہ پھر برآمدے میں آگئی۔ تو رام دُلاری نے جیسے رحم کی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ جیجا جی کی کچھ ترقی ورقی ہوئی کہ نہیں بہن۔ یا ابھی تک وہی پچھتر پر قلم گھِس رہے ہیں۔

روپ کماری کے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ افوہ رے دماغ گویا اس کا شوہر لاٹ ہی توہے۔ اکڑ کر بولی۔ ترقی کیوں نہیں ہوئی۔ اب سَو کے گریڈ میں ہیں۔ آج کل یہ بھی غنیمت ہے۔ مَیں تو اچھے اچھے ایم۔ اے پاسوں کو دیکھتی ہوں کہ کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا۔ تیرا شوہر اب بی۔ اے میں ہوگا۔"

اُنھوں نے تو پڑھنا چھوڑ دیا بہن! پڑھ کر اوقات خراب کرنا تھا۔ اور کیا ایک ۔۔۔ کے ایجنٹ ہو گئے ہیں۔ اب ڈھائی سو روپیہ ماہوار پاتے ہیں۔ کمیشن اوپر سے پانچ روپیہ روز سفرخرچ کے بھی ملتے ہیں یہ جو سمجھ لو کہ پانچ سو کا اوسط پڑ جاتا ہے۔ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تو ان کا ذاتی خرچ ہے۔ بہن! اونچے عہدہ پر ہیں تو اچھی حیثیت بھی بنائے رکھنی لازم ہے۔ ساڑھے تین سو روپیہ بے داغ گھر دیدیتے ہیں۔ اس میں سو روپیہ مجھے ملتے ہیں۔ ڈھائی سو میں گھر کا خرچ خوش فعلی سے چل جاتا ہے۔ ایم اے پاس کر کے کیا کرتے۔"

روپ کماری اسے شیخ چلّی کی داستان سے زیادہ وقعت نہ دینا چاہتی تھی مگر رام دلاری کے لہجے میں اتنی صداقت ہے کہ تحت الشعور میں وہ اس سے متاثر ہو رہی ہے اور اس کے چہرے پر خفّت اور شکست کی بدمزگی صاف جھلک رہی ہے۔ مگر اُسے اپنے ہوش وحواس کو قائم رکھنا ہے تو اس اثر کو دل سے مٹا دینا پڑیگا۔ اسے جرحوں سے اپنے دل کو یقین کرا دینا پڑے گا کہ اس میں ایک چوتھائی سے زیادہ حقیقت نہیں ہے۔ وہاں تک وہ برداشت کرلے گی۔ اس سے زیادہ وہ کیسے برداشت کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں دھڑکن بھی ہے کہ کہیں یہ روداد سچ نکلی تو وہ کیسے رام دلاری کو مُنہ دکھائیگی۔ اُسے اندیشہ ہے کہ کہیں

اس کی آنکھوں سے آنسو نہ نکل پڑیں۔ کہاں پچھتر اور کہاں پانچ سو۔ اتنی بڑی رقم ضمیر کا خون کر کے بھی کیوں نہ ملے۔ پھر بھی روپ کماری اس کی متحمل نہیں ہو سکتی ضمیر کی قیمت زیادہ سے زیادہ سو روپیہ ہو سکتی ہے پانچسو کسی حالت میں نہیں۔

اس نے تمسخر کے انداز سے پوچھا "جب ایجنٹی میں اتنی تنخواہ اور بھتے ملتے ہیں تو کالج بند کیوں نہیں ہو جاتے۔ ہزاروں لڑکے کیوں اپنی زندگی خراب کرتے ہیں"

رام دلاری بہن کی خفت کا مزہ اٹھاتی ہوئی بولی "بہن تم یہاں غلطی کر رہی ہو۔ ایم۔ اے تو سب ہی پاس ہو سکتے ہیں۔ مگر ایجنٹی کرنی کس کو آتی ہے۔ یہ خداداد ملکہ ہے۔ کوئی زندگی بھر پڑھتا رہے۔ مگر ضروری نہیں کہ وہ اچھا ایجنٹ ہو جائے۔ روپیہ پیدا کرنا دوسری چیز ہے۔ علمی فضیلت حاصل کرنا دوسری چیز۔ اپنے مال کی خوبی کا یقین پیدا کر دینا۔ یہ ذہن نشین کرا دینا کہ اس سے ارزاں اور دیرپا چیز بازار میں مل ہی نہیں سکتی۔ آسان کام نہیں ہے۔ ایک سے ایک گاہکوں سے ان کا سابقہ پڑتا ہے۔ بڑے بڑے راجاؤں اور رئیسوں کی تالیف قلب کرنی پڑتی ہے اوروں کی تو ان راجاؤں اور نوابوں کے سامنے جانے کی ہمت بھی نہ پڑے۔ اور کسی طرح پہنچ جائیں تو زبان نہ نکلے۔ شروع شروع میں انہیں بھی جھجک ہوئی تھی۔ مگر اب تو اس دریا کے نگر ہیں۔ اگلے سال ترقی ہونے والی ہے۔

روپ کماری کی رگوں میں جیسے خون کی حرکت بند ہوئی جا رہی ہے۔ ظالم آسمان کیوں نہیں گر پڑتا۔ بے رحم زمین کیوں نہیں پھٹ جاتی۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ روپ کماری جو حسین ہے۔ تمیز دار ہے۔ کفایت شعار ہے۔ اپنے شوہر پر جان دیتی ہے۔ بچوں کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ اس کی جان سے

زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ اس کی اس خستہ حالی میں بسر ہو۔ اور یہ بدتمیز، تن پرور، چنچل چھوکری رانی بن جائے مگر اب بھی کچھ اُمید باقی تھی۔ شاید اس کی تسکین قلب کا کوئی رستہ نکل آئے۔

اُسی تمسخر کے انداز سے بولی "تب تو شاید ایک ہزار ملنے لگیں ؟"

ایک ہزار تو نہیں، مگر چھ سو میں شبہ نہیں "

کوئی آنکھ کا اندھا مالک بن گیا ہوگا "

" بیوپاری آنکھ کے اندھے نہیں ہوتے۔ جب تم انہیں چھ ہزار کما کر دو تب کہیں چھ سو ملیں۔ جو ساری دنیا کو چرائے اُسے کوئی کیا بیوقوف بنائے گا "

تمسخر سے کام چلتے نہ دیکھ کر روپ کماری نے تحقیر شروع کی "میں تو اس کو بہت معزز پیشہ نہیں سمجھتی۔ سارے دن جھوٹ کے طومار باندھو۔ یہ تو ٹھگ بدیا ہے "

رام دُلاری زور سے ہنسی، روپ کماری پر اس نے کامل فتح پائی تھی "اُس طرح تو جتنے وکیل، بیرسٹر ہیں۔ سب ہی ٹھگ بدیا کرتے ہیں۔ اپنے موکل کے فائدے کے لئے انہیں جھوٹی شہادتیں تک بنانی پڑتی ہیں۔ مگر انہیں وکیلوں کو ہم اپنا لیڈر کہتے ہیں۔ انہیں اپنی قومی سبھاؤں کا صدر بناتے ہیں۔ ان کی گاڑیاں کھینچتے ہیں ان پر پھولوں کی اور زر و جواہر کی برکھا کرتے ہیں۔ آج کل دنیا پیسہ دیکھتی ہے۔ پیسے کیسے آئے یہ کوئی نہیں دیکھتا۔ جس کے پاس پیسہ ہو اس کی پوجا ہوتی ہے۔ جو بدنصیب ہیں۔ نا قابل ہیں۔ پست ہمت ہیں۔ ضمیر اور اخلاق کی دُھائی دے کر اپنے آنسو پونچھ لیتے ہیں۔ ورنہ ضمیر اور اخلاق کو کون پوچھتا ہے "

روپ کماری خاموش ہو گئی۔ اب اُسے یہ حقیقت اس کی ساری تلخیوں کے ساتھ تسلیم کرنی پڑے گی کہ رام دُلاری اس سے زیادہ خوش نصیب ہے اس سے مفر نہیں تمسخر یا تحقیر سے وہ اپنی تنگ دلی کے اظہار کے سوا اور کسی نتیجے پہ نہیں پہنچ سکتی۔ اُسے کسی بہانہ سے رام دلاری کے گھر جاکر اصلیت کی چھان بین کرنی پڑے گی اگر رام دلاری واقعی لکشمی کا بردان پا گئی ہے تو وہ اپنی قسمت ٹھونک کر بیٹھ رہے گی۔ سمجھ لے گی کہ دنیا میں کہیں انصاف نہیں ہے۔ کہیں ایما نداری کی قدر نہیں ہے۔

مگر کیا سچ مچ اُس خیال سے اُسے تسکین ہو گی۔ یہاں کون ایما ندار ہے؟ نہی جسے بے ایمانی کا موقعہ نہیں ہے۔ اور نہ اتنی ہمت ہے کہ وہ موقعہ پیدا کر لے اس کے شوہر ۵، روپیہ ماہوار پاتے ہیں۔ مگر کیا دس بیس روپیئے اوراوپر سے مل جائیں تو وہ خوش ہو کر لے نہ لیں گے۔ ان کی ایمانداری اور اصول پروری اس وقت تک ہے جب تک موقعہ نہیں ملتا جس دن موقعہ ملا ساری اصول پروری دھری رہ جائیگی۔ اور تب کیا رُوپ کماری میں اتنی اخلاقی قوت ہے کہ وہ اپنے شوہر کو ناجائز آمدنی سے روک دے؟ روکنا تو درکنار وہ خوش ہو گی۔ شاید اپنے شوہر کی پیٹھ ٹھونکے ابھی ان کے دفتر سے واپسی کے وقت من مارے بیٹھی رہتی ہے۔ تب دروازے پر کھڑی ہو کر ان کا انتظار کرے گی۔ اور جونہی وہ گھر میں آئیں گے اُن کی جیبوں کی تلاشی لے گی۔

آنگن میں گانا بجانا ہو رہا تھا۔ رام دلاری اُمنگ کے ساتھ گا رہی تھی اور روپ کماری وہیں برآمدے میں اُداس بیٹھی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کے سر میں درد

ہونے لگا تھا۔ کوئی گائے کوئی ناچے، اُسے کوئی سروکار نہیں وہ تو بدنصیب ہے رونے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

نو بجے رات کے مہمان رخصت ہونے لگے روپ کماری بھی اُٹھی یکہ منگوانے جا رہی تھی کہ رام دلاری نے کہا "یکہ منگوا کر کیا کرو گی بہن، مجھے لینے کے لئے ابھی کار آتی ہوگی۔ دو چار دن میرے یہاں رہو۔ پھر چلی جانا۔ میں جیجاجی کو کہلا بھیجوں گی۔"

رُوپ کماری کا آخری حربہ بھی بیکار ہو گیا۔ رام دلاری کے گھر جا کر ریاست حال کی خواہش یکایک فنا ہو گئی۔ وہ اب اپنے گھر جائے گی اور منہ ڈھانپ کر پڑ رہے گی۔ ان پھٹے حالوں کیوں کسی کے گھر جائے۔ بولی۔ "بہن ابھی تو مجھے فرصت نہیں ہے۔ پھر کبھی آؤں گی۔"

"کیا رات بھر بھی نہ ٹھہرو گی؟"

"نہیں میرے سر میں زور سے درد ہو رہا ہے۔"

"اچھا بتاؤ کب آؤ گی۔ میں سواری بھیج دوں گی۔"

"میں خود کہلا بھیجوں گی۔"

"تمہیں یاد نہ رہے گی۔ سال بھر ہو گیا۔ بھول کر بھی یاد نہ کیا۔ میں اسی انتظار میں تھی کہ دیدی بلائیں تو چلوں۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہیں پھر بھی اتنی دُور کہ سال سال بھر گذر جائے اور ملاقات نہ ہو۔"

گھر کی فکروں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ کئی بار ارادہ کیا کہ تجھے بلا بھیجوں مگر موقع ہی نہ ملا۔"

اتنے میں رام دلاری کے شوہر مسٹر گروسیوک نے آکر بڑی سالی کو سلام کیا۔ بالکل انگریزی وضع تھی۔ کلائی پر سونے کی گھڑی۔ آنکھوں پر سنہری عینک بالکل اپ ٹو ڈیٹ۔ جیسے کوئی تازہ وارد سویلین ہو۔ چہرے سے ذہانت متانت اور شرافت برس رہی تھی۔ وہ اتنا خوشرو اور جامہ زیب ہے۔ رُوپ کماری کو کبھی گمان نہ تھا۔

دُعا دیکر بولی "آج یہاں نہ آتی تو تم سے ملاقات کیوں ہوتی"

گروسیوک ہنس کر بولا" بجا فرماتی ہیں۔ اُلٹی شکایت کبھی آپ نے بُلایا اور میں نہ گیا"

"میں نہیں جانتی تھی کہ تم اپنے کو مہمان سمجھتے ہو وہ بھی تمہارا ہی گھر ہے"

"اب مان گیا بھابی صاحب۔ بیشک میری غلطی ہے۔ انشاء اللہ اس کی تلافی کرونگا۔ مگر آج ہمارے گھر رہیئے"

"نہیں آج بالکل فرصت نہیں ہے۔ پھر آؤنگی۔ لڑکے گھر پر گھبرا رہے ہوں گے"

رام دُلاری بولی "میں کتنا کہہ کے ہار گئی۔ مانتی ہی نہیں"

دونوں بہنیں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ گروسیوک ڈرائیو کرتا ہوا چلا۔ ذرا دیر میں اُس کا مکان آگیا۔ رام دلاری نے پھر رُوپ کماری سے چلنے کے لئے اصرار کیا۔ مگر وہ نہ مانی۔ لڑکے گھبرا رہے ہوں گے۔ آخر رام دُلاری اُس سے گلے مل کر اندر چلی گئی۔ گروسیوک نے کار بڑھائی، رُوپ کماری نے اُڑتی ہوئی نگاہ سے رام دلاری کا مکان دیکھا اور وہ ٹھوس حقیقت سلاخ

کی طرح اس کے جگر میں چُبھ گئی۔ کچھ دُور چل کر گرو سیوک بولا" بھابی! میں نے اپنے لئے کیسا اچھا راستہ نکال لیا۔ اگر دو چار سال کام چل گیا تو آدمی بن جاؤں گا"

رُوپ کماری نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔" رام دلاری نے مجھ سے کہا بھگوان کرے جہاں رہو خوش رہو۔ ذرا ہاتھ پَیر سنبھال کر رہنا"

میں مالک کی آنکھ بچا کر ایک پیسہ لینا بھی گناہ سمجھتا ہوں دولت کا مزہ تو جب ہے کہ ایمان سلامت رہے۔ ایمان کھو کے پیسے ملے تو کیا۔ میں ایسی دولت پہ لعنت بھیجتا ہوں۔ اور آنکھ کس کی بچاؤں۔ سب سیاہ سفید تو میرے ہاتھ میں ہے۔ مالک تو کوئی ہے نہیں۔ اس کی بیوہ ہے۔ اس نے سب کچھ میرے ہاتھ میں چھوڑ رکھا ہے۔ میں نے اس کا کاروبار نہ سنبھال لیا ہوتا تو سب کچھ چوپٹ ہو جاتا۔ میرے سامنے تو مالک صرف تین مہینے زندہ رہے مگر بڑا مردم شناس آدمی تھا۔ مجھے ننو پر رکھا اور ایک ہی مہینے میں ڈھائی سو کر دیئے۔ آپ لوگوں کی دُعا سے پہلے ہی مہینے میں میں نے بارہ ہزار کا کام کیا"

" کام کیا کرنا پڑتا ہے"

دہی مشینوں کی ایجنٹی، طرح طرح کی مشینیں منگانا اور بیچنا"

رُوپ کماری کا منحوس گھر آگیا۔ دروازے پر ایک لال ٹین ٹمٹما رہی تھی اس کے شوہر بابو اُمانا تھ دروازے پر ٹہل رہے تھے۔ روپ کماری اُتری مگر اُس نے گرو سیوک سے آنے کے لئے اصرار نہ کیا۔ بے دلی سے کہا ضرور مگر زور نہ دیا۔ اور اُمانا تھ تو مخاطب ہی نہ ہوئے۔

رُوپ کماری کو وہ گھر اب قبرستان سا لگ رہا تھا۔ جیسے بُھوٹا ہوا

نصیب ہو۔ نہ کہیں فرش نہ فرنیچر نہ گملے۔ دو چار ٹوٹی ٹاٹی کرسیاں، ایک لنگڑی میز، چار پانچ پرانی دھرانی کھاٹیں یہی اس گھر کی بساط تھی۔ آج صبح تک روپ کماری اس گھر میں خوش تھی۔ لیکن اب اس گھر سے اسے مطلق دلچسپی نہ رہی۔ لڑکے اماں اماں کر کے دوڑے مگر اس نے دونوں کو جھڑک دیا۔ سر میں درد ہے وہ کسی سے نہ بولے گی۔ ابھی تک کھانا نہیں پکا۔ پکاتا کون؟ لڑکوں نے تو دودھ پی لیا ہے، مگر اُماناتھ نے کچھ نہیں کھایا۔ اسی انتظار میں تھے کہ روپ کماری آئے تو پکائے مگر روپ کماری کے سر میں درد ہے، مجبوراً بازار سے پوریاں لانی پڑیں گی۔

روپ کماری نے ملامت آمیز انداز سے کہا۔ "تم اب تک میرا انتظار کیوں کرتے رہے۔ میں نے کھانا پکانے کا ٹھیکہ تو نہیں لیا ہے۔ اور جو رات بھر وہیں رہ جاتی؟ آخر تم ایک مہراجن کیوں نہیں رکھ لیتے یا زندگی بھر مجھی کو پیستے رہو گے؟"

اُماناتھ نے اس کی طرف مظلوم اور پُر سوال حیرت کی نگاہ ڈالی۔ اس کی برہمی کا کوئی سبب ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ روپ کماری سے اُنھوں نے ہمیشہ بے عُذر اطاعت پائی ہے۔ بے عُذر ہی نہیں، خوش دلانہ بھی۔ انھوں نے کئی بار اس سے مہراجن رکھ لینے کی تجویز اور خواہش کی تھی۔ مگر اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ آخر میں بیٹھے بیٹھے کیا کروں گی۔ چار پانچ روپیہ کا خرچ بڑھانے سے کیا فائدہ۔ یہ رقم بچ رہے گی تو بچوں کے لئے مکھن آجائے گا۔ اور آج وہ اتنی بے دردی سے شکایت کر رہی ہے جیسے غصہ میں بھری ہو۔

اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولے "مہراجن رکھنے کے لئے میں نے تم سے کئی بار کہا۔"

"تو لا کر کیوں نہ دیا۔ میں اُسے نکال دیتی تو کہتے؟"

"ہاں یہ غلطی ہوئی؟"

"تم نے کبھی سچے دل سے کہا۔ محض مہراجن لینے کے لئے کہا۔ تمہارے دل میں کبھی میرے آرام کا خیال آیا ہی نہیں۔ تم تو خوش تھے کہ اچھی لونڈی ہاتھ لگی ہے۔ ایک روٹی کھاتی ہے اور چُپ چاپ پڑی ہے۔ اتنی سستی لونڈی اور کہاں ملتی۔ محض کھانے اور کپڑے پر وہ بھی جب گھر بھر کی ضرورتوں سے بچے، پچھتر روپیاں لاکر میرے ہاتھ پر رکھ دیتے ہو۔ اور ساری دنیا کا خرچ، میرا دل ہی جانتا ہے، مجھے کتنی کتربیونت کرنی پڑتی ہے۔ کیا پہنوں اور کیا اوڑھوں، تمہارے ساتھ زندگی خراب ہو گئی۔ وہ مرد بھی ہوتے ہیں۔ جو بیویوں کے لئے آسمان کے تارے توڑ لاتے ہیں۔ گرد سیوک ہی کو دیکھو تم سے کم پڑھا ہے۔ عمر میں تم سے کہیں کم ہے مگر پانچسو روپیہ مہینہ لاتا ہے اور رام دلاری رانی بنی بیٹھی رہتی ہے۔ تمہارے لئے یہ ہی پچھتر بہت ہیں رانڈ مانڈ میں ہی خوش۔ تم ناحق مرد ہوئے۔ تمہیں تو عورت ہونا چاہیئے تھا۔ اور دل کے دل میں کیسے کیسے ارمان ہوتے ہیں۔ مگر میں تو تمہارے لئے گھر کی مرغی باسی ساگ ہوں تمہیں تو کوئی تکلیف ہوتی نہیں تم ہو۔ تو کپڑے بھی اچھے چاہئیں۔ کھانا بھی اچھا چاہیئے، کیونکہ تم مرد ہو۔ باہر سے کما کر لاتے ہو۔ میں چاہے جیسے رہوں تمہاری بلا سے......"

یہ سلسلہ کئی منٹ تک جاری رہا اور بیچارے اُما ناتھ خاموش سُنتے رہے۔ اپنی دانست میں اُنھوں نے روپ کماری کو شکایت کا کوئی موقعہ نہیں دیا ان کی تنخواہ کم ہے ضرور، یہ ان کے بس کی بات تو نہیں، وہ دل لگا کر اپنا کام کرتے

ہیں۔ افسروں کو خوش رکھنے کی ہمیشہ کوشش کرتے ہیں۔ اس سال بڑے بابو کے چھوٹے صاحبزادے کو چھ مہینہ تک بلا ناغہ پڑھایا۔ اسی لئے تو کہ وہ خوش رہیں اب اور کیا کریں۔ روپ کماری کی برہمی کا راز تو انہیں معلوم ہو گیا۔ اگر گرو سیوک واقعی پانچسو روپیہ لاتا ہے تو بیشک خوش نصیب ہے، لیکن دوسروں کی اونچی پیشانی دیکھ کر اپنا ماتھا تو نہیں پھوڑا جاتا۔ اُسے یہ موقع مل گیا۔ دوسروں کو ایسے موقعے کہاں ملتے ہیں وہ تحقیق کریں گے کہ واقعی اسے پانچسو ملتے ہیں یا محض گپ ہے اور بالفرض ملتے ہی ہوں تو اس سے کیا روپ کماری کو یہ حق ہے کہ وہ انہیں نشانۂ ملامت بنائے اگر اسی طرح وہ روپ کماری سے زیادہ حسین زیادہ خوش سلیقہ عورت دیکھ کر اسے کوسنا شروع کر دیں تو کیسا ہو۔ روپ کماری حسین ہے۔ شیریں زبان ہے۔ خوش مذاق ہے۔ بیشک لیکن اس سے زیادہ حسین، زیادہ شیریں، زیادہ خوش مذاق عورت دنیا میں معدوم نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ان کی نظروں میں روپ کماری سے زیادہ حسین عورت دنیا میں نہ تھی، لیکن وہ جنون اب باقی نہیں رہا۔ جذبات کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آئے نہیں، ایک مدت گذر گئی۔ اب تو انہیں ازدواجی زندگی کا کافی تجربہ ہے، ایک دوسرے کے عیب و ہنر معلوم ہو گئے ہیں۔ اب تو صابروشاکر رہ کر ہی ان کی زندگی عافیت سے کٹ سکتی ہے۔ روپ کماری اتنی موٹی سی بات بھی نہیں سمجھتی۔

پھر بھی انہیں روپ کماری سے ہمدردی ہوئی۔ اس کی سخت کلامیوں کا انھوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ شربت کی طرح پی گئے۔ اپنی بہن کا ٹھاٹ دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے روپ کماری کے دل میں ایسے دلشکن مایوس کن، غیر منصفانہ خیالات

کا پیدا ہونا بالکل فطری ہے، وہ کوئی فلاسفر نہیں، تارک الدنیا نہیں کہ ہر حال میں اپنے طبعی سکون کو قائم رکھے۔ اس طرح اپنے دل کو سمجھا کر اُما ناتھ دریافت حال کی مہم کے لئے آمادہ ہو گئے۔

(۳)

ایک ہفتہ تک رُوپ کماری ہیجان کی حالت میں رہی۔ بات بات پر جھنجھلاتی لڑکوں کو ڈانتی، شوہر کو کوستی، اپنی تقدیر کو روتی گھر کا کام تو کرنا ہی پڑتا تھا۔ ورنہ نئی آفت آجاتی۔ لیکن اب کسی کام سے اسے دلچسپی نہ تھی گھر کی جن پرانی دھرانی چیزوں سے اسے دلی تعلق ہو گیا تھا۔ جن کی صفائی اور سجاوٹ میں وہ منہمک رہا کرتی تھی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ گھر میں ایک ہی خدمتگار تھا۔ اس نے جب دیکھا بہو جی گھر کی طرف سے خود ہی لاپرواہ ہیں۔ تو اسے کیا غرض تھی کہ صفائی کرتا۔ دونوں بچے بھی ماں سے بولتے ڈرتے تھے، اور اُما ناتھ تو اس کے سایہ سے بھاگتے تھے جو کچھ سامنے آجاتا زہر مار کر لیتے اور دفتر چلے جاتے۔ دفتر سے لوٹ کر دونوں بچوں کو ساتھ لے لیتے۔ اور کہیں گھومنے نکل جاتے، روپ کماری سے کچھ بولتے رُوح فنا ہوتی تھی۔ ہاں ان کی تفتیش جاری تھی۔

ایک دن اُما ناتھ دفتر سے لوٹے تو ان کے ساتھ گروسیوک بھی تھے۔ رُوپ کماری نے آج کئی دن کے بعد زمانہ سے مصالحت کر لی تھی اور اس وقت جھاڑن لئے کرسیاں اور تپائیاں صاف کر رہی تھی کہ گروسیوک نے اسے اندر پہنچ کر سلام کیا روپ کماری دل میں کٹ گئی۔ اُما ناتھ پر بے حد غصہ آیا۔ انہیں لاکر یہاں کیوں کھڑا کر دیا نہ کہنا نہ سننا بس بُلا لائے اسے اس حالت میں دیکھ کر گروسیوک نے دل

میں کیا سمجھا ہوگا۔ مگر انہیں عقل آئی ہی کب تھی۔ وہ اپنا پردہ ڈھانکتی پھرتی ہے اور آپ اسے کھولتے پھرتے ہیں۔ ذرا بھی شرم نہیں، جیسے بے حیائی کا جامہ پہن لیا ہے! خواہ مخواہ اسے ذلیل کرتے ہیں۔

• دُعا دیکر عافیت پوچھی اور کُرسی رکھدی۔ گروسیوک نے بیٹھتے ہوئے کہا آج بھائی صاحب نے میری دعوت کی ہے۔ میں ان کی دعوت پر تو نہ آتا۔ لیکن اُنھوں نے کہا کہ تمہاری بھابی کا سخت تقاضہ ہے، تب مجھے وقت نکالنا پڑا۔

رُوپ کماری نے بات بنائی۔" تم سے اُس دن رواروی میں ملاقات ہوئی دیکھنے کو جی لگا ہوا تھا!"

گروسیوک نے در و دیوار پر نظر ڈال کر کہا" اس پنجرے میں تو آپ لوگوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی!"

روپ کماری کو اب معلوم ہوا کہ یہ کتنا بد مذاق ہے۔ دوسروں کے جذبات کی اسے بالکل پرواہ نہیں! یہ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتا کہ دنیا میں سبھی تقدیر والے نہیں ہوتے۔ لاکھوں میں کہیں ایک ایسا ہی بھگوان نکلتا ہے۔ کسی قدر ترش ہو کر بولی۔" پنجرے میں رہنا کٹگھرے میں رہنے سے اچھا ہے۔ پنجرے میں معصوم چڑیاں رہتی ہیں۔ کٹگھر تو درندوں کا مسکن ہے۔"

گروسیوک کنایہ نہ سمجھ سکا۔ بولا مجھے تو اس گھر میں حبس ہو جائے دم گھٹ جائے۔ میں آپ کے لئے اپنے گھر کے پاس ایک گھر ٹھیک کر دوں گا۔ خوب لمبا چوڑا آپ سے کچھ کرایہ نہ لیا جائیگا۔ مکان ہماری مالکن کا ہے۔ میں بھی تو اسی کے مکان میں رہتا ہوں۔ سینکڑوں مکان ہیں۔ اس کے پاس سینکڑوں۔ سب میرے

اختیار میں ہیں۔ جس کو جو مکان چاہے دیدوں میرے اختیار میں ہے کرایہ لوں یا نہ لوں، میں آپ کے لئے اچھا سا مکان ٹھیک کر دوں گا۔ جو سب سے اچھا ہے۔ میں آپ کا بہت ادب کرتا ہوں ......"

رُوپ کماری سمجھ گئی، حضرت اس وقت نشہ میں ہیں جب ہی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں، ان کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ رُخسار سے کچھ پھول گئے تھے۔ زبان میں ہلکی سی لغزش تھی۔ جو ہر لمحہ نمایاں ہوتی جاتی تھی۔ ایک جوان، خوبصورت، شریف چہرہ رکیک اور بے غیرت بن گیا تھا۔ جسے دیکھ کر نفرت ہوتی تھی۔

اس نے ایک لمحہ بعد پھر بہکنا شروع کیا۔ میں آپ کا بہت ادب کرتا ہوں۔ آپ میری بڑی بھابی ہیں۔ آپ کے لئے میری جان حاضر ہے۔ آپ کے لئے مکان کا انتظام کرنا میرے لئے کچھ مشکل نہیں۔ میں مسز لوہیا کا مختار ہوں، سب کچھ میرے اختیار میں ہے۔ سب کچھ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ آنکھیں بند کر کے منظور کر لیتی ہے۔ مجھے اپنا بیٹا سمجھتی ہے، میں اس کی ساری جائداد کا مالک ہوں۔ مسٹر لوہیا نے مجھے بیس روپیہ کا نوکر رکھا تھا۔ بڑا مالدار آدمی تھا۔ مگر یہ کسی کو معلوم نہیں اس کی دولت کہاں سے آتی تھی کسی کو معلوم نہیں۔ میرے سوا کوئی جانتا نہیں وہ خفیہ فروش تھا۔ کسی سے کہنا نہیں وہ خفیہ فروش تھا کوکین بیچتا تھا۔ لاکھوں کی آمدنی تھی اس کی۔ میں اب بھی وہی کام کرتا ہوں۔ ہر شہر میں ہمارے ایجنٹ ہیں۔ مسٹر لوہیا نے مجھے اس فن میں یکتا کر دیا۔ جی ہاں، مجال نہیں کہ کوئی مجھے گرفتار کرلے۔ بڑے بڑے افسروں سے میرا یارانہ ہے، ان کے مُنہ میں نوٹوں کے پلندے ٹھونس ٹھونس کر انکی آواز بند کر دیتا ہوں۔ کوئی چوں نہیں کر سکتا۔ حساب میں لکھتا ہوں ایک ہزار

دیتا ہوں پانچسو، باقی یاروں کا ہے۔ بے دریغ روپے آتے ہیں اور بے دریغ خرچ کرتا ہوں، بڑھیا کو تو رام نام سے مطلب ہے۔ سادھو سنتوں کی سیوا میں لگی رہتی ہے اور بندہ ہمیں کرتا ہے۔ جتنا چاہوں خرچ کروں کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ کوئی بولنے والا نہیں، (جیب سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر) یہ آپ کے قدموں کا صدقہ ہے مجھے دعا دیجئے جو ایمان اور اصول کے اپاسک ہیں انہیں دولت لات مارتی ہے۔ دولت تو انہیں پکڑتی ہے جو اس کے لئے اپنا دین اور ایمان سب کچھ نثار کرنے کو تیار ہیں۔ مجھے بُرا نہ کہیئے۔ جتنے دولتمند ہیں، سب لٹیرے ہیں، میں بھی انہیں میں ایک ہوں کل میرے پاس روپے ہو جائیں اور میں ایک دھرم سالہ بنوادوں پھر دیکھئے میری کتنی واہ واہ ہوتی ہے۔ کون پوچھتا ہے، مجھے یہ دولت کہاں سے ملی ایک وکیل گھنٹہ بھر بحث کر کے ایک ہزار سیدھا کر لیتا ہے ایک ڈاکٹر ذرا سا نشتر لگا کر پانچسو روپیہ مار لیتا ہے۔ اگر ان کی آمدنی جائز ہے تو میری آمدنی بھی جائز ہے، جی ہاں جائز ہے۔ ضرورت مندوں کو لوٹ کر مالدار ہو جانا ہماری سوسائٹی کا پرانا دستور ہے، میں بھی وہی کرتا ہوں جو دوسرے کرتے ہیں زندگی کا مقصد ہے عیش کرنا۔ میں بھی لوٹوں گا۔ عیش کروں گا اور خیرات کروں گا اور ایک دن لیڈر بن جاؤں گا۔ کہیئے گنوا دوں، یہاں کتنے لوگ جوا کھیل کر کروڑ پتی ہو گئے کتنے عورتوں کا بازار لگا کر کروڑ پتی ہو گئے .... اُما ناتھ نے آ کر کہا۔ "مسٹر گروسیوک کیا کر رہے ہو، چلو چارپی لو ٹھنڈی ہو رہی ہے"

گروسیوک اُٹھا پیر لڑکھڑائے اور زمین پر گر پڑا۔ پھر سنبھل کر اٹھا اور جھومتا جھامتا ٹھوکریں کھاتا باہر چلا گیا۔ شوپ کماری نے آزادی کا سانس لیا۔ یہاں

بیٹھے بیٹھے اس کا دَم گھٹ رہا تھا۔ کمرہ کی ہَوا جیسے کچھ بھاری ہو گئی تھی۔ جو ترغیبیں کئی دن سے اچھے اچھے دلاویز رُوپ بھر کر اس کے سامنے آ رہی تھیں آج اسے اُن کی اصلی مکروہ، گھناؤنی صورت نظر آئی۔ جس سادگی اور خلوص اور ایثار کی فضا میں اب تک زندگی گذری تھی۔ اس میں حرامکاری اور آبلہ فریبی کا گذر نہ تھا۔ ان راہوں وہ دنیا کی ساری دولت اور سارا عیش بھی خریدنے کو آمادہ نہ ہو سکتی تھی۔ اب وہ رام دلاری کی تقدیر سے اپنی تقدیر کا بدلا نہ کرے گی وہ اپنے حال میں خوش ہے، رام دُلاری پر اُسے رحم آیا۔ جو نمود و نمائش کے لیئے اپنے ضمیر کا خون کر رہی ہے مگر ایک ہی لمحہ میں گرو سیوک کی طرف سے اُس کا دل نرم پڑ گیا۔ جس سوسائٹی میں دولت پُجتی ہے۔ جہاں انسان کی قیمت اس کے بینک اکاؤنٹ اور اس کی شان و شوکت سے آنکی جاتی ہے، جہاں قدم قدم پر ترغیبوں کا جال بچھا ہوا ہے اور سوسائٹی کا نظام اتنا بے ڈھنگا ہے کہ انسان میں حسد اور غصب اور خود مائیگی کے جذبات کو اُکساتا رہتا ہے۔ وہاں گرو سیوک اگر رَو میں بہ جائے تو تعجب کا مقام نہیں۔

اس وقت اُمانا تھ نے آکر کہا۔ یہاں بیٹھا بیٹھا کیا تک رہا تھا؟ میں نے تو اُسے رخصت کر دیا۔ جی ڈرتا تھا کہیں اس کے پیچھے پولیس لگی ہو۔ کہیں میں ناکردہ گناہ پکڑا جاؤں"۔

رُوپ کماری نے اس کی طرف معذرت خواہانہ نظر سے دیکھ کر جواب دیا" وہی اپنی خفیہ فروشی کا ذکر کر رہا تھا"

"مجھے بھی مسز لوہیا سے ملنے کی دعوت دے گیا ہے۔ شاید کوئی اچھی جگہ مل جائے۔"

"جی نہیں! آپ اپنی کلرکی کئے جائیے۔ اسی میں آپ کی خیریت ہے۔"

"مگر کلرکی میں عیش کہاں؟ کیوں نہ سال بھر کی رخصت لے کر ذرا ادھر کا بھی لطف اٹھاؤں۔"

"مجھے اب وہ ہوس نہیں رہی۔"

"میں تم سے آکر یہ قصہ کہتا تو تمھیں یقین نہ آتا۔"

"ہاں یقین تو نہ آتا۔ میں تو قیاس ہی نہیں کرسکتی کہ اپنے فائدے کے لئے کوئی آدمی دنیا کو زہر کھلا سکتا ہے۔"

مجھے سارا قصہ معلوم ہوگیا تھا۔ میں نے اسے خوب شراب پلا دی تھی کہ نشہ میں بہکے گا۔ ضرور سب کچھ خود قبول دیگا۔"

"للچائی تو تمہاری طبیعت بھی تھی؟"

"ہاں للچائی تو ہے مگر عیب کرنے کے لئے جس ہنر کی ضرورت ہے وہ کہاں سے لاؤں گا۔"

"ایشور نہ کرے وہ ہنر تم میں آئے۔ مجھے تو اس بچارے پر ترس آتا ہے۔ معلوم نہیں راستہ میں اس پر کیا گذری؟"

"نہیں وہ تو اپنی کار پر تھے۔"

روپ کماری ایک منٹ تک زمین کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی:۔

"تم مجھے دُلاری کے گھر پہنچا دو۔ ابھی شاید میں اس کی مدد کو سکوں جس باغ کی وہ سیر کر رہی ہے، اس کے چاروں طرف درندے گھات لگائے بیٹھے ہوئے ہیں۔ شاید میں اُسے بچا سکوں۔"

"عصمت" اکتوبر ۱۹۳۶ء

زاویۂ نگاہ!

جب ماں بیٹے سے بہو کی شکایتوں کا دفتر کھول دیتی ہے اور یہ سلسلہ کسی طرح ختم ہوتا نظر نہیں آتا تو بیٹا اُکتا جاتا ہے۔ اور دن بھر کی تکان کے باعث کچھ جھنجھلا کر ماں سے کہتا ہے "تو آخر تم مجھ سے کیا کرنے کو کہتی ہو اماں، میرا کام بیوی کو تعلیم دینا تو نہیں ہے، یہ تو تمہارا کام ہے، تم اسے ڈانٹو، مارو جو سزا چاہو دو میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ تمہاری کوشش سے اسے سلیقہ، تمیز، ادب، خدمت، سب کچھ آجائے۔"

ماں۔ "واہ زبان سے بات تو نکلنے دیتی نہیں۔ ڈانٹوں تو مجھے نیچ ہی کھائے اس کے سامنے اپنی آبرو بچاتی پھرتی ہوں کہ کسی کے منہ پر کوئی نازیبا بات نہ کہہ بیٹھے۔"

بیٹا۔ "تو پھر اس میں میری کیا خطا ہے میں تو اس کو سکھا نہیں دیتا کہ تم سے بے ادبی کرے۔"

ماں۔ "تو اور کون سکھاتا ہے؟"

بیٹا۔ "تم اندھیر کرتی ہو اماں!"

ماں۔ "اندھیر نہیں کرتی حقیقت کہتی ہوں۔ تمہاری ہی شہ پاکر وہ اتنی دلیر ہو گئی ہے۔ جب وہ تمہارے پاس جاکر ٹسوے بہاتی ہے تو کبھی تم نے اسے ڈانٹا۔

کبھی سمجھایا کہ ساری خطا تیری ہے تم خود اس کے غلام ہو گئے ہو وہ بھی سمجھتی ہے کہ میرا شوہر کماتا ہے پھر میں کیوں نہ حکومت کروں۔ کیوں کسی سے دبوں۔ مرد جب تک شہ نہ دے عورت کا اتنا گروہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

بیٹا:" تو کیا میں اس سے کہدوں کہ میں کچھ نہیں کماتا۔ بالکل نکھٹو ہوں کیا تم سمجھتی ہو تب وہ مجھے ذلیل نہ سمجھے گی۔ ہر فرد چاہتا ہے کہ اس کی بیوی اسے کماؤ لائق، نیک نام سمجھے اور قدرتاً وہ جتنا ہے اس سے بڑھ کر اپنے کو ظاہر کرتا ہے میں نے یہ حماقت کبھی نہیں کی۔ لیکن بیوی کی نگاہوں میں اتنا وقار تو کوئی بھی کھونا نہ چاہے گا۔"

ماں۔" تم کان لگا کر اور دھیان دیکر اور ہمہ تن گوش بن کر اور حسرت خیز تبسم کے ساتھ اس کی باتیں سنو گے تو وہ کیوں نہ شیر ہو گی۔ تم خود چاہتے ہو کہ بیوی کے ہاتھوں مجھے ذلیل کراؤ۔ معلوم نہیں میرے کن گناہوں کی یہ سزا تم مجھے دے رہے ہو، کن کن ارمانوں سے کیسی کیسی قربانیاں کر کے میں نے تمہیں پالا۔ خود نہیں پہنا۔ تمہیں پہنایا۔ خود نہیں کھایا۔ تمہیں کھلایا، میرے لئے تم اس مرنے والے کی محبت کی یادگار تھے۔ اور میری ساری آرزوؤں کے مرکز۔ تمھاری تعلیم پر میں نے اپنے ہزاروں کے زیور قربان کر دیئے۔ بیوہ کے پاس دوسرا کون اثاثہ تھا۔ اس کا تم مجھے یہ صلہ دے رہے ہو؟"

بیٹا۔" میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔ آپ کے احسانوں کو میں کب فراموش کرتا ہوں۔ آپ نے مجھے صرف تعلیم نہیں دی۔ مجھے زندگی عطا کی۔ زیور ہی نہیں قربان کیئے اپنا خون تک پلایا۔ اگر میں سو بار جنم لوں تو بھی اس کا

صلہ نہیں دے سکتا۔ میں اپنے علم میں آپ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا۔ آپ کی خدمت میں حتی الامکان دریغ نہیں کرتا۔ جو کچھ پاتا ہوں آپ کے ہاتھوں میں لاکر رکھ دیتا ہوں۔ اور آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔ خدا نے ہمیں اور آپ کو اور ساری دُنیا کو پیدا کیا۔ اس کا ہم اسے کیا صلہ دیتے ہیں؟ کیا صلہ دے سکتے ہیں؟ اس کا نام بھی تو نہیں لیتے اس کے احسانوں کا اعتراف تک نہیں کرتے اس سے کیا خدا کے احسانوں کا بار کچھ کم ہو جاتا ہے، ماں کی قربانیوں کا صلہ کیا کوئی بیٹا دے سکتا ہے، چاہے وہ ساری دُنیا کا مہاراج ہی کیوں نہ ہو زیادہ سے زیادہ میں آپ کی دلجوئی ہی تو کر سکتا ہوں۔ اور مجھے یاد نہیں آتا۔ کہ میں نے اس میں کچھ اُٹھا رکھا ہو۔"

ماں۔ "تم میری دلجوئی کرتے ہو! تمھارے گھر میں میں اس طرح رہتی ہوں جیسے کوئی مزدورنی۔ تمھاری بیوی کبھی میری بات بھی نہیں پوچھتی۔ میں بھی کبھی بہو تھی، رات کو گھنٹہ بھر تک ساس کا بدن دباتی۔ سر میں تیل ڈالتی۔ تب بستر پر پاؤں رکھتی تھی۔ تمھاری بیوی نو بجے اپنے ... میں لے کر سیج میں جا بیٹھتی ہے۔ دونوں کھڑکیاں کھول لیتی ہے اور ... سے ہوا کھاتی ہے میں مروں یا جیوں، اسے مطلب نہیں اسی لئے میں نے تمھیں پالا تھا؟"

بیٹا۔ "تم نے مجھے پالا تھا تو تمھیں مجھ سے یہ شکایت ہونی چاہیئے تھی۔ مگر تم نے مجھ سے کبھی شکایت نہیں کی۔ میرے احباب ہیں ان میں بھی کسی کو اپنی ماں کے بدن پر تکیاں لگاتے نہیں دیکھتا۔ آپ میرے فرض یا خدمت کا بار میری بیوی پر کیوں ڈالتی ہیں۔ یوں اگر وہ آپ کی خدمت کرے تو مجھ سے زیادہ خوش اور کوئی نہ ہوگا۔

اسکی عزت میری نظروں میں بڑھ جائیگی۔ شاید اس سے محبت بھی زیادہ کرنے لگوں لیکن اگر وہ آپ کی خدمت نہیں کرتی تو آپ کو ناراض ہونیکا کوئی موقعہ نہیں ہے۔ شاید میں اسکی جگہ ہوتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔ ساس مجھے اپنی لڑکی کی طرح پیار کرتی۔ مجھ پہ جان نثار کرتی، تو میں بھی جان ودل سے خدمت کرتا۔ اس لئے کہ وہ میری بیوی کی ماں ہوتی بلکہ اس لئے کہ وہ مجھ پر مادرانہ شفقت رکھتی۔ مجھے یہ بُرا معلوم ہوتا ہے کہ بہو ساس کے پیر دبائے۔ کچھ دن پہلے عورتیں اپنے شوہروں کے پیر دبایا کرتی تھیں۔ شاید آج بھی ایسی عورتیں موجود ہوں۔ لیکن میری بیوی میرا جسم دبائے تو مجھے روحانی تکلیف ہو۔ میں اس سے ایسی کوئی خدمت لینی نہیں چاہتا جو میں اس کی نہ کرسکوں۔ یہ رسم اس زمانہ کی یادگار ہے۔ جب عورت شوہر کی لونڈی سمجھی جاتی تھی۔ اب مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ کم سے کم میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔"

ماں:" وہ تو میں کہتی ہوں کہ تمہیں نے اُسے پڑھاکر شیر کردیا ہے۔ تمہیں مجھ سے دشمنی کررہے ہو۔ ایسی بے ادب، ایسی دیدہ دلیر، ایسی بدزبان، ایسی پھوہڑ چھوکری زمانہ میں نہ ہوگی۔ گھر میں اکثر محلہ کی بہنیں آتی رہتی ہیں یہ راجہ کی بیٹی نہ جانے کن دہقانوں میں پلی ہے کہ کسی کی خاطر وتعظیم نہیں کرتی۔ کمرے سے نکلتی تک نہیں۔ وہ بیچاریاں کبھی کبھی اُسے دیکھنے کے لئے اُس کے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ مگر یہ مزے سے پڑی رہتی ہے۔ مُنہ اٹھتی تک نہیں۔ پیر چھونا تو دُور کی بات ہے۔"

بیٹا:" وہ بڑی بوڑھی عورتیں تم سے ملنے آتی ہوں گی۔ تمہارے اور ان کے بیچ میں نہ جانے کیا باتیں ہوتی ہوں۔ اگر تمہاری بہو بیچ میں آکودے تو میں اُسے بدتمیز کہوں گا۔ کم سے کم میں تو کبھی پسند نہ کروں گا کہ جب میرے احباب بیٹھے ہوں تو

جاکر کھڑی ہو جاؤ۔ بیوی بھی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی ہو تو میں ہرگز بغیر بلائے نہ جاؤنگا یہ تو آج کل کی تہذیب ہے۔"

ماں۔"تم ہر بات میں اُسی کی پچ کرتے ہو بیٹا۔ نہ جانے اس نے کونسی جڑی سُونگھادی ہے۔ تمہیں یہ کون کہتا ہے کہ ہم لوگوں کے بیچ میں آ کُودے۔ لیکن تم سے بڑوں کی تواضع و تکریم تو کرنی چاہیئے۔

بیٹا۔"کیوں کر؟"

ماں۔"جاکر آنچل سے اُن کے قدم چھوئے۔ پرنام کرے، پان کھلائے، پنکھا جھلے کیا اس سے اتنا بھی نہیں ہوتا۔ ان ہی باتوں سے بہو کی قدر ہوتی ہے جو دیکھتا ہے تعریف کرتا ہے۔ نہیں سب کی سب یہی کہتی ہوں گی کہ بہو کو گھمنڈ ہو گیا ہے کسی سے بات کرنے تک کی روادار نہیں۔"

بیٹا۔(غور کرکے) ہاں یہ ضرور اس کی خطا ہے میں سمجھا دوں گا۔"

ماں۔"(خوش ہو کر) تم سے سچ کہتی ہوں بیٹا! چارپائی سے اُٹھتی تک نہیں بلکہ اور پردہ گرالیتی ہے۔ سب عورتیں تھوڑی تھوڑی کرتی ہیں۔ مگر اُسے تو شرم جیسے چھو بھی نہیں گئی۔ اور میں ہوں کہ مارے شرم کے مری جاتی ہوں۔"

بیٹا۔"یہی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ہر بات میں اپنے کو اسکے فعلوں کا ذمہ دار کیوں سمجھ لیتی ہو۔ کیوں اپنی جان ضیق میں ڈالتی ہو۔ مجھ پہ دفتر میں جانے کتنی گھڑکیاں پڑتی ہیں، روز ہی تو جواب طلب ہوتا ہے۔ لیکن تمہیں اُلٹی میرے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے کیا تم سمجھتی ہو افسروں کو مجھ سے کوئی کد ہے جو خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑے رہتے ہیں یا انہیں جُنون ہو گیا ہے جو بے وجہ مجھے کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔

نہیں اس کا سبب یہی ہے کہ میں اپنے کام میں چوکس نہیں ہوں غلطیاں کرتا ہوں۔ جہاں افسر سامنے سے ٹلا اور اخبار بینی شروع ہوئی یا ایک لوگ تاش کھیلنے لگے۔ کیا اس وقت ہمیں یہ خیال نہیں رہتا کہ کام کرنے کو پڑا ہے اور کھیلنا مناسب نہیں۔ لیکن کون پرواکرتا ہے۔ سوچتے ہیں صاحب ڈانٹ ہی تو بتائیں گے۔ ہم جھکا کر سُن لیں گے اور تم مجھے خطاوار سمجھ کر بھی مجھ سے ہمدردی کرتی ہو۔ اور تمھارا بس چلے تو ہمارے بڑے بابو کو مجھ سے جواب طلب کرنے کے جرم میں کالے پانی بھیج دو۔"

ماں۔ (شگفتہ ہوکر) "میرے لڑکے کو کوئی ڈانٹے گا تو کیا میں پان پھول سے اس کی پوجا کروں گی!"

بیٹا۔" ہر ایک بیٹا اپنی ماں سے اسی طرح کی اندھی ہمدردی کی توقع رکھتا ہے۔ اور سب مائیں اپنے لڑکوں کے عیبوں پر پردہ ڈالتی ہیں۔ مگر بہو کی جانب سے کیوں دل سخت ہو جاتا ہے یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تمھاری بہو کی بے ادبیوں پر محلہ کی خواتین برہم ہوتی ہیں تو تمہیں چاہیئے کہ بہو کی جانب سے معذورت کرو۔ اسکی طبیعت ناساز ہے ابھی نادان بھولی بھالی ہے یا اور کوئی بہانہ اس باز پرس میں تم کیوں دوسروں کی شریک ہو جاتی ہو؟ تم کو اسکی تذلیل میں کیوں مزہ آتا ہے میں بھی تو ہر ایک برہمن بڑے بوڑھے کی تعظیم نہیں کرتا۔ میں کسی ایسے شخص کے روبرو سر جھکا ہی نہیں سکتا جس سے مجھے عقیدت نہ ہو۔ محض سفید بال اور جلد کی جھرّیاں اور پوپلا منہ اور خمیدہ کمر کسی کو قابل تعظیم نہیں بنا دیتی۔ اور نہ جنیو اور تلک یا پنڈت اور شرما کا لقب ہی احترام کی چیز ہے۔ میں رسمی تعظیم کو اخلاقی جرم سمجھتا ہوں۔ میں تو اسی کی عزت کرونگا جو اپنے قول و فعل اور نیت، ہر اعتبار سے میری نظروں میں برگزیدہ ہے۔ جسے

میں جانتا ہوں مکاری اور بدگوئی کے سوا اور کچھ نہیں کرتا۔ جو رشوت سود اور خوشامد
کی کمائی کھاتا ہے وہ اگر خضر کی عمر لے کر بھی آئے تو میں اُسے سلام نہ کروں۔ اسے
تم تکبر کہہ سکتی ہو۔ لیکن جب تک میرا دل نہ جھکے میرا سر بھی نہ جھکے گا۔ ممکن ہے تمہاری
بہو کے دل میں بھی ان بڑی بوڑھیوں کی طرف سے کچھ اسی قسم کے خیالات ہوں۔
ان میں سے دو چار کو میں بھی جانتا ہوں۔ میں وہ سب بڑے گھر کی۔ لیکن نمائش
اور نخوت کی پتلیاں کوئی غیبت میں فرد۔ کوئی خوشامد میں یکتا۔ کوئی بدزبانی میں بے مثل
سب کی سب رسوم کی غلام، حسد سے جلنے والی، تم سے بہو کی شکایت کریں گی
اور بہو سے تمہاری بُرائی شروع کر دیں گی۔ ایک بھی ایسی نہیں جس نے اپنے گھر کو
دوزخ کا نمونہ نہ بنا رکھا ہو۔ اگر تمہاری بہو ایسی عورتوں کے آگے سر نہیں جھکاتی تو
میں اس سے باز پرس نہیں کر سکتا۔"

ماں۔ "اچھا اب چپ رہو بیٹا! دیکھ لینا اگر ایک دن تمہاری بہو تم سے چولہا
نہ جلوائے، گھر میں جھاڑو نہ لگوائے تو سہی۔ عورتوں کو بہت سر پر چڑھانا اچھا نہیں۔ اس
بےحیائی کی بھی کوئی حد ہے کہ بوڑھی ساس تو کھانا پکائے اور بہو بیٹھی قصے پڑھتی رہے۔"

بیٹا۔ "بےشک یہ بُری بات ہے اور میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم کھانا پکاؤ اور وہ
قصے پڑھے، چاہے وہ قصے پریم چند ہی کے کیوں نہ ہوں لیکن یہ خیال کرنا ضروری ہے
کہ اس نے اپنے گھر میں کبھی کھانا نہیں پکایا۔ اسکے گھر میں مہاراج رسوئیا ہے اور جب چولہے
کے سامنے جانے سے اس کے سر میں درد ہونے لگتا ہے تو اُسے کھانا پکانے کیلئے
مجبور کرنا اس پر ظلم کرنا ہے میں تو سمجھتا ہوں جوں جوں ہمارے گھر کی حالت اس پر
روشن ہوگی۔ اس کی عادتوں میں خود بخود اصلاح ہوتی جائے گی۔ یہ اس کے

گھر والوں کی غلطی ہے کہ اُنھوں نے اسکی شادی کسی متمول گھر میں نہ کی۔ ہم نے بھی یہ غلطی کی کہ اپنی اصلی حالت اُن سے چھپائی اور یہ ظاہر کیا کہ ہم پرانے رئیس ہیں۔ اب ہم کس مُنہ سے کہہ سکتے ہیں کہ تو کھانا پکا، یا برتن مانجھ یا جھاڑو لگا۔ ہم نے ان لوگوں کو دھوکا دیا۔ اور اس کا خمیازہ ہمیں اُٹھانا پڑیگا۔ اب تو ہماری خیریت اسی میں ہے کہ اپنی کم مائگی کو انکساری اور ہمدردی اور دلجوئی سے ڈھانکیں اور اسے اپنے دل کو یہ تسلّی دینے کا موقعہ دیں کہ بلا سے دولت نہیں ملی، گھر کے آدمی تو اچھے ملے۔ اگر یہ تسلّی بھی ہم نے اس سے چھین لی تو تمہیں سوچو اسے کتنا دلخراش صدمہ ہوگا۔ شاید وہ ہم لوگوں کی صورت سے نفرت کرنے لگے۔"

ماں۔ اُس کے گھر والوں کو سو دفعہ غرض تھی تب ہمارے ہاں شادی کی ہم کچھ ان کی خوشامد کرنے گئے تھے۔"

بٹیا۔" ان کو اگر لڑکے کی غرض تھی تو ہمیں روپے اور لڑکی دونوں کی غرض تھی۔"

ماں۔" یہاں کے بڑے بڑے رئیس ہم سے رشتہ کرنے کو مُنہ پھیلائے ہوئے تھے۔"

بٹیا۔" اسی لئے کہ ہم نے رئیسوں کا سا سوانگ بنا رکھا ہے۔ گھر کی اصلی حالت کھل جائے تو کوئی بات بھی نہ پوچھے۔"

ماں۔" تو تمھارے سسرال والے ایسے کہاں کے بڑے خاندانی رئیس ہیں۔ ادھر ذرا لالہ کی وکالت چل گئی تو رئیس ہو گئے۔ یہیں تمھارے سسر کے باپ میرے سامنے محرری کرتے تھے اور لڑکی کو یہ دماغ کہ کھانا پکانے سے سر میں درد ہوتا ہے، اچھے اچھے گھروں کی لڑکیاں غریبوں کے گھر آتی ہیں، اور گھر کی حالت دیکھکر ویسا ہی برتاؤ کرتی ہیں یہ نہیں کہ اپنی تقدیر کو کوسا کریں۔ اس چھوکری نے ہمارے گھر کو اپنا گھر سمجھا ہی نہیں

بیٹیا۔ "جب تم سمجھنے بھی دو، جس گھر میں گھرکیوں اور خفگیوں اور نکتہ چینیوں کے سوا اور کچھ نہ ملے اِسے اپنا گھر کون سمجھے۔ گھر تو وہ ہے جہاں محبت اور پیار ملے۔ کوئی بھی لڑکی آتے ہی اپنی ساس کو ماں نہیں سمجھ سکتی۔ ماں جب ہی سمجھے گی۔ جب ساس پہلے اس کے ساتھ ماں کا برتاؤ کرے بلکہ اپنی لڑکی سے زیادہ عزیز سمجھے۔"

ماں۔ "اچھا اب چپ رہو جی نہ جلاؤ۔ یہ زمانہ ہی ایسا ہے کہ لڑکوں نے بیوی کا مُنہ دیکھا اور اس کے غلام ہوئے۔ یہ سب نہ جانے کونسا منتر سیکھ کر آتی ہیں۔ یہ بھی بہو بیٹی کے لچھن ہیں کہ پہر دن چڑھے سو کر اُٹھیں۔"

بیٹیا۔ "میں بھی تو دیر میں سو کر اُٹھتا ہوں اماں۔ مجھے تو تم نے کبھی نہیں کوسا۔"

ماں۔ "بیٹا تم ہر بات میں اس سے اپنی برابری کرتے ہو۔"

بیٹیا۔ "جو اسکے ساتھ زیادتی ہے۔ کیونکہ جبتک وہ اس گھر کو اپنا نہیں سمجھتی تب تک اسکی حیثیت مہمان کی سی ہے اور مہمان کی ہم خاطر کرتے ہیں، اس کے عیب نہیں دیکھتے۔"

ماں۔ "ایشور نہ کرے کسی کو ایسی بہو ملے۔"

بیٹیا۔ "تو وہ تمھارے گھر میں رہ چکی۔"

ماں۔ "کیا دُنیا میں عورتوں کی کمی ہے؟"

بیٹیا۔ "عورتوں کی تو کمی نہیں۔ مگر دیویوں کی کمی ضرور ہے۔"

ماں۔ "نوج ایسی عورت، سونے لگتی ہے تو بچہ چاہے اِدھر روتے مرجائے مسکتی تک نہیں، پھول سا بچہ لیکر میکے گئی تھی، تین مہینے میں لوٹی تو بچہ آدھا بھی نہیں ہے۔"

بیٹیا۔ "تو کیا میں یہ مان لوں کہ تمہیں لڑکے سے جتنی محبت ہے اتنی اسے نہیں ہے؟ یہ تو قدرت کے قانون کے خلاف ہے اور مان لو وہ نرموہن ہی ہے، تو یہ اس کی

خطا ہے تم کیوں اسکی ذمہ داری اپنے سر لیتی ہو۔ اُسے کامل آزادی ہے جس طرح چاہے اپنے بچے کو پالے۔ اگر وہ تم سے کوئی صلاح پوچھے، خندہ پیشانی سے بتلا دو، نہ پوچھے تو سمجھ لو کہ اسے تمھاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر ماں اپنے بچے کو پیار کرتی ہے اور وہ مستثنیٰ نہیں ہے۔

ماں :" تو میں سب کچھ دیکھوں اور زبان نہ کھولوں ؟ گھر میں آگ لگتے دیکھوں اور خاموش کھڑی رہوں "

بیٹا :" تم اس گھر کو جلد چھوڑنے والی ہو۔ مجھے بہت دن رہنا ہے۔ گھر کے نفع نقصان کی جتنی فکر مجھے ہو سکتی ہے اتنی تمہیں نہیں ہو سکتی۔ پھر میں کر ہی کیا سکتا ہوں، ڈانٹ بتا سکتا ہوں۔ لیکن وہ ڈانٹ کی پرواہ نہ کرے اور مجھے دو بدو جواب دے تو میرے پاس ایسا کونسا ذریعہ ہے جس سے اُسے راستہ پر لا سکوں ؟ "

ماں :" تم دو دن نہ بولو تو دیوتا سیدھے ہو جائیں۔ سامنے ناک رگڑے "

بیٹا :" مجھے اس کا یقین نہیں ہے۔ میں اس سے نہ بولوں گا وہ مجھ سے نہ بولیگی زیادہ سختی کروں گا تو اپنے گھر چلی جائے گی "

ماں :" ایشور وہ دن لائے میں تمھارے لئے نئی بیوی لاؤں "

بیٹا :" یہ ممکن ہے وہ اس سے بھی زیادہ نالائق ہو "

دفعتہ بہو آکر کھڑی ہو جاتی ہے، ماں بیٹے دونوں پر ایک ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ گویا کوئی بم کا گولہ آگرا ہو۔ حسین اور نازک مزاج اور مغرور عورت ہے۔ رخسارے تمتماتے ہوئے ہیں۔ مگر ہونٹوں پر زہر آلود تبسم ہے اور آنکھوں میں طنز آمیز تمسخر۔

ماں :" (اپنی خفت کو چھپا کر) تمہیں کون بلانے گیا تھا ؟ "

بہو۔ "کیوں؟ یہاں جو تماشا ہو رہا ہے۔ اُس کا لطف میں نہ اُٹھاؤں؟"

بیٹا۔ "ماں بیٹے کے بیچ میں تمہیں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

(بہو کا تمسخر غصہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے)

بہو۔ "اچھا آپ خاموش رہیئے گا، جو شوہر اپنی بیوی کی بُرائیاں سُنتا رہے، وہ شوہر بننے کے قابل نہیں، وہ شوہریت کا الف بے بھی نہیں جانتا۔ مجھ سے اگر کوئی تمہاری بُرائی کرنا چاہے، وہ میری پیاری ماں ہی کیوں نہ ہوتی تو میں اس کی زبان پکڑ لیتی۔ تم میرے گھر جاتے ہو تو وہاں تو جیسے دیکھتی ہوں تمہاری تعریف ہی کرتا ہے۔ چھوٹے سے بڑے تک غلاموں کی طرح دوڑتے پھرتے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو لوگ تمہارے لئے سرگ کے تارے توڑ لائیں اور اس کا جواب مجھے یہاں یہ ملتا ہے کہ بات بات پر نکتہ چینی، عیب جوئی، خفگی، گالیاں، طعنے، میرے گھر تو تم سے کوئی نہیں کہتا، آج تم دیر سے کیوں اُٹھے، تم نے فلاں کو کیوں نہیں سلام کیا، فلاں کے قدموں پر سر کیوں نہیں ٹیک دیا۔ میرے بابوجی یہ کبھی نہ گوارا کریں گے کہ تم ان کے جسم پر مکیاں لگاؤ، یا ان کی دھوتی چھانٹو یا انہیں کھانا پکا کر کھلاؤ۔ میرے ساتھ یہ برتاؤ کیوں! میں لونڈی بنکر نہیں آئی ہوں، تمہاری رفیق حیات بن کر آئی ہوں مگر رفیق کے یہ معنی تو نہیں کہ تم میری بُرائیاں خاموشی سے سُنو۔ یہ میرے اوپر منحصر ہے کہ جس طرح چاہوں تمہارے ساتھ رفاقت کا حق ادا کروں۔ اس کی تحریک میرے دل سے ہونی چاہیئے۔ مجبوری یا جبر سے نہیں۔ اگر کوئی مجھ کو کچھ سکھانا چاہتا ہے تو ماں کی طرح سکھائے میں سیکھوں گی۔ لیکن امرت بھی کوئی زبردستی میری چھاتی پر چڑھ کر میرے حلق میں ٹھونسنا چاہے تو میں ہونٹ بند کر لوں گی۔ میں ابتک کب کی

اس گھر کو اپنا سمجھ چکی ہوتی۔ کب کی تقدیر کی شاکر ہو چکی ہوتی۔ مگر یہاں تو ہر گھڑی ہر وقت ہر لمحہ ٹھونکے اور کچوکے دے دے کر یاد دلایا جاتا ہے کہ تو اس گھر کی لونڈی ہے، تیرا اس گھر سے کوئی ناتا نہیں۔ تو صرف غلامی کرنے کے لئے یہاں لائی گئی ہے اور میرا خون کھول کھول کر رہ جاتا ہے۔ اگر یہی حال رہا تو ایک دن تم میری جان لے کر رہو گے۔"

ماں۔ "سُن رہے ہو اپنی چہیتی بیگم کی باتیں۔ یہاں لونڈی بنکر نہیں، رانی بن کر آئی ہے۔ ہم دونوں اس کی خدمت کرنے کے لئے ہیں۔ اس کا کام ہمارے اوپر حکومت کرنا ہے۔ اسے کچھ کام کرنے کو کوئی نہ کہے۔ میں خود مرا کروں، اور تم اس کی باتیں کان لگاکر سُنتے رہو۔ تمہارا مُنہ کبھی نہیں کُھلتا کہ اسے ڈانٹو یا سمجھاؤ۔ تھر تھر کانپتے ہو۔"

بیٹا۔ "اچھا اماں، ٹھنڈے دل سے سوچو، میں اس کی باتیں نہ سنوں تو کون سُنے کیا تم اس کے ساتھ ہمدردی بھی نہیں دیکھنا چاہتیں، آخر بابوجی زندہ تھے تب وہ تمہاری باتیں سنتے تھے یا نہیں؟ تمہیں پیار کرتے تھے یا نہیں۔ پھر اگر میں اپنی بیوی کی باتیں سنتا ہوں تو کونسی نئی بات کرتا ہوں۔ اور اس میں بُرا ماننے کی کون بات ہے۔"

ماں۔ "ہائے بیٹا! تو اپنی بیوی کے روبرو مجھے ذلیل اور شرمندہ کر رہا ہے۔ اسی دن کے لئے میں نے تجھے پال پوس کر بڑا جوان کیا تھا۔ کیوں میری چھاتی نہیں پھٹ جاتی۔"

میاں۔ "ماں کا دل........

بیوی۔ "ماں کا دل نہیں، عورت کا دل۔"

میاں۔ "یعنی؟"

بیوی۔ "جو آخر دم تک مرد کا سہارا چاہتا ہے ناز برداری چاہتا ہے اور اس پر

کسی عورت کا عیش دیکھ کر حسد سے جل اُٹھتا ہے "

میاں۔ "کیا پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو "

بیوی۔ "حقیقت کہتی ہوں "

میاں۔ "تم بالکل غلط زاویۂ نگاہ سے دیکھتی ہو۔ اور اس کا تجربہ نہیں جب ہوگا جب تم خود ساس ہوگی "

بیوی۔ "مجھے ساس نہیں بننا ہے لڑکا اپنے ہاتھ پیر کا ہو جائے تب شادی کرے اور اپنا گھر سنبھالے۔ مجھے بہو سے کیا مطلب "

میاں۔ "تمہیں یہ ارمان بالکل نہیں ہے کہ تمہارا لڑکا لائق ہو۔ سعادت مند ہو اور اس کی زندگی خوشی سے گذرے "

بیوی۔ "کیا میں ماں نہیں ہوں؟"

میاں۔ "ماں اور ساس میں کیا کوئی فرق ہے "

بیوی۔ "اتنا ہی جتنا زمین اور آسمان میں ہے۔ سیاہ اور سفید میں ہے، ماں پیار کرتی ہے، ساس حکومت کرتی ہے۔ کتنی ہی نیک، شریف اور حلیم عورت ہو، ساس بنتے ہی گویا دماغ کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ جس بیٹے سے جتنی ہی زیادہ محبت ہے وہ بہو پر اتنی ہی زیادہ سختی سے حکومت کرتی ہے۔ مجھے بھی اپنے اوپر اعتبار نہیں ہے حکومت پا کر کسے خوف نہیں ہو جاتا، اس لئے میں نے طے کر لیا ہے کہ ساس بنوں گی ہی نہیں، عورت کی غلامی ساسوں کے بل پر قائم ہے۔ جس دن ساسیں نہ رہیں گی۔ عورت کی غلامی کا بھی خاتمہ ہو جائیگا "

میاں۔ "میرا خیال ہے تم ذرا دنیا وی عقل سے کام لو تو اماں پر حکومت

کرسکتی ہو، تم نے ہماری باتیں کچھ سُنی تھیں؟"

بیوی: "بغیر سُنے ہی میں سمجھ گئی کیا باتیں ہو رہی ہوں گی، وہی بہو کا رونا"

میاں: "نہیں نہیں، تم نے بالکل غلط سمجھا۔ اماں کے مزاج میں آج یہ حیرت انگیز انقلاب دیکھا۔ بالکل حیرت انگیز۔ آج وہ اپنی بے مہریوں پر نادم ہو رہی تھیں، ہاں علانیہ نہیں، کنایتہً۔ اب تک وہ تم سے اس لئے ناراض رہتی تھیں کہ تم دیر میں اُٹھتی ہو، اب شاید انہیں اندیشہ ہوا ہے کہ کہیں سویرے اُٹھنے سے سردی نہ ہو جائے۔ تمہارے لئے پانی گرم کر دیا کریں گی"

بیوی: (خوش ہو کر) "سچ؟"

میاں: "ہاں، سُنکر مجھے بھی تعجب ہوا"

بیوی: "تو اب میں مُنہ اندھیرے اُٹھوں گی۔ ایسی سردی کیا لگ جائے گی۔ لیکن تم مجھے چکمہ تو نہیں دے رہے ہو"

میاں: "اب اس بدگمانیوں کا کیا علاج ہے۔ انسان کو کبھی کبھی اپنی بے انصافیوں پر افسوس تو ہوتا ہی ہے"

بیوی: "تمہارے مُنہ میں گھی شکر۔ میں گجردم اُٹھوں گی، وہ غریب میرے لئے کیوں پانی گرم کریں، میں خود گرم کروں گی۔ آدمی کرنا چاہے تو کیا نہیں کر سکتا"

میاں: "مجھے تو آپکی باتیں سُنکر ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ جیسے کسی غیبی تحریک نے آپ کے ضمیر کو روشن کر دیا ہو۔ وہ تمہارے اطوار پر، تمہاری خوشیوں پر کتنا برہم ہوتی تھیں، چاہتی تھیں کہ جب کوئی بڑی بوڑھی گھر میں آجائے تو تم اس کے قدم چومو۔ لیکن اب شاید انہیں معلوم ہونے لگا ہے۔ کہ اس عمر کا یہی

تقاضا ہے بنایا۔ انہیں خود اپنی جوانی یاد آرہی ہے۔ کہتی تھیں یہی شوق سنگار کے پہننے اوڑھنے کے، کھانے کھیلنے کے دن ہیں، بوڑھیوں کا تو دن بھر تانا لگا رہتا ہے۔ کوئی کہاں تک ان کے پیر چھوتے اور کیوں چھوئے کہاں کی بڑی دیویاں ہیں"

بیوی۔ "مجھے تو شادی مرگ ہوا چاہتی ہے"

میاں۔ "میں تو مرتے مرتے بچا"

بیوی۔ "اتنے دنوں کے بعد اب آئی ہیں راہ پر"

میاں۔ "کوئی غیبی تحریک یا الہام سمجھو"

بیوی۔ "میں کل سے ٹھیٹھ بہو بن جاؤں گی۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوگی کہ میں کب اپنا میک آپ کرتی ہوں۔ سنیما دیکھنے کے لئے ہفتہ میں ایک دن کافی ہے بوڑھیوں کے پاؤں چھو لینے میں ہی کیا حرج ہے۔ وہ دیویاں چڑیلیں سہی۔ مجھے دُعا تو دیں گی ہی، میری تعریف تو کریں گی ہی"

میاں۔ "لیکن سوچو تم نے کتنی اونچی تعلیم پائی ہے۔ کس خاندان کی ہو"

بیوی۔ "تعلیم کے یہ معنی ہیں کہ آدمی خواہ مخواہ دوسروں کو ذلیل سمجھے بوڑھے کتنے ہی جاہل ہوں لیکن دُنیا کا تجربہ رکھتے ہی ہیں۔ خاندان کی عزت بھی انکسار اور خوش خلقی سے ہوتی ہے، غرور و بدخلقی سے نہیں"

میاں۔ "مجھے تو تعجب ہوتا ہے کہ اتنی جلد انکی کایا پلٹ کیونکر ہوگئی، اب انہیں بہوؤں کا ساس کے پاؤں دبانا، یا ان کی ساڑھی دھونا یا تکیاں لگانا معیوب معلوم ہو رہا ہے۔ کہتی تھیں، بہو کوئی لونڈی تھوڑے ہی ہے کہ بیٹھی

پاؤں دبائیے "

بیوی ۔" میری قسم "

میاں ۔" ہاں جی ۔ سچ کہتا ہوں ، اور تو اور اب وہ تمہیں کھانا بھی پکانے نہ دیتی تھیں ۔ جب بہو کے سر میں درد ہونے لگتا ہے تو کیوں اسے دقت کیا جائے ۔ کوئی مہراج رکھ لو "

بیوی ۔ (باغ باغ ہوکر) میں تو آسمان میں اُڑی جارہی ہوں ۔ مگر تم نے پُوچھا نہیں ۔ ابتک تم کیوں اسے کھانا پکانے کے لئے زور دیتی تھیں "

میاں " پوچھا کیوں نہیں ، بھلا میں یوں چھوڑنے والا تھا ۔ بولیں میری غلطی تھی ۔ میں نے ہمیشہ کھانا پکایا ہے ۔ پھر بہو کیوں نہ پکائے ۔ لیکن اب ان پر روشن ہوا ہے کہ وہ غریب باپ کی بیٹی تھیں تم رئیس کی بیٹی ہو "

بیوی ۔" اماں جی ، دل کی خراب نہیں ہیں "

میاں ۔" بس ذرا پُرانی لکیر پر جان دیتی ہیں "

بیوی ۔ اسے میں قابل معافی سمجھتی ہوں جس آب و گل سے ہماری پرورش ہوئی ہے اسے ہم یکبارگی نہیں بدل سکتے جن آداب و رسوم کی وہ عادی ہو گئی ہیں انہیں یک لخت چھوڑ دینا ان کے لئے مشکل ہے وہ کیا کوئی بھی نہیں چھوڑ سکتا وہ تو پھر بھی بہت روشن خیال ہیں ۔ تم مہراج مت رکھو ۔ خواہ مخواہ پریشانی کیوں مول لو ۔ جب ترقی ہو جائے تو رکھ لینا ۔ ابھی میں خود پکا لیا کروں گی تین چار آدمیوں کا کھانا ہی کیا ۔ میں جانتی سب ہوں ۔ لیکن کوئی حکومت کرنا چاہے تو پھر مجھ سے بُرا کوئی نہیں "

میاں: "مگر یہ تو مجھے بُرا لگے گا کہ تم رات کو اماں کے پاؤں دبانے بیٹھو۔"

بیوی: "بُرا لگنے کی کونسی بات ہے۔ جب انہیں میرا اتنا خیال ہے تو مجھے بھی ان کا خیال کرنا چاہیئے۔ جس دن میں ان کے پاؤں دبانے بیٹھوں گی وہ مجھ پر جان دے دینگی۔ آخر بہو بیٹے کا کچھ سکھ انہیں بھی تو ہو۔ بڑوں کی خدمت کرلے میں ہیٹی نہیں ہوتی۔ ہاں بُرا جب لگتا ہے، جب وہ حکومت کرتے ہیں۔"

میاں: "اب تو اماں کو تمہاری فضول خرچی بھی بُری نہیں لگتی۔ کہتی تھیں روپے پیسے بہو کے ہاتھ میں دیا کرو۔"

بیوی: "چڑھ کر تو نہیں کہتی تھیں؟"

میاں: "نہیں نہیں مشورۃً کہتی تھیں۔ انہیں اب خیال ہو رہا ہے کہ اُن کے ہاتھ میں پیسے رہنے سے تمہیں تکلیف ہوگی۔ تم بار بار ان سے مانگتی شرماتی ہوگی۔ اور تمہیں اپنی ضرورتوں کو روکنا ہوگا۔"

بیوی: "نا بھیا۔ میں یہ جنجال اپنے سر نہ لوں گی۔ تمہاری تھوڑی سی آمدنی ہے کہیں جلدی سے خرچ ہو جائے تو گھر کا خرچ چلنا مشکل ہو جائے تھوڑے میں نباہ کرنے کی ودّیا انہیں کو آتی ہے۔ میری ایسی کونسی ضرورتیں ہیں۔ میں تو صرف اماں کو چڑھانے کے لئے بار بار ان سے روپے مانگتی تھی۔ میرے پاس سو پچاس روپے کے نوٹ ضرور رہتے ہیں۔ لیکن مجھے اب ہاتھ روکنا ہے۔ آخر بابوجی مجھے کب تک دیتے رہیں گے۔ اور یہ ک[illegible] تم [illegible] ان پہ ٹیکس لگاتی رہوں۔"

میاں: "دیکھ لینا اماں [illegible]

بیوی۔ "تم بھی دیکھ لینا میں ان کی کتنی خدمت کرتی ہوں۔"

میاں۔ "مگر شروعات تو ان کی جانب سے ہوئی۔"

بیوی۔ "عملی شروعات میری ہی جانب سے ہوگی۔ کھانا پکانے کا وقت آگیا میں چلتی ہوں۔ آج کوئی خاص چیز تو نہ کھاؤ گے؟"

میاں۔ "تمہارے ہاتھوں کی روکھی روٹیاں بھی پکوان کا مزہ دیں گی۔"

بیوی۔ "اب تم شرارت کرنے لگے۔"

"عصمت" ۱۹۳۵ء

انتباہ و اطلاع

اس کتاب کے افسانوں کا دائمی حق اشاعت منشی پریم چند آنجہانی نے مجھے دیا تھا اس لئے بغیر میری اجازت کوئی صاحب اس کتاب کو یا اس کے کسی افسانہ کو شائع نہ فرمائیں ورنہ اخلاقی ہی نہیں قانونی جرم کے بھی مرتکب ہونگے اور انہیں اسکا بہت خمیازہ بھگتنا پڑیگا۔ [illegible] ان کتب جسقدر جلدیں اس کتاب کی نیز منشی جی کے ڈرامہ [illegible] ت دہلی سے طلب کر سکتے ہیں۔ رازق الخیری